Registered No. L. 4186

شوال ｝ ۱۳۵۹ھ
ذی القعدة ｝

جلد ۱۷ - عدد ۴
جلد ۱۷ - عدد ۵

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ صہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلا توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

ماہ شوال و ذی القعدہ ۵۹ھ (مطابق دسمبر ۴۰ء و جنوری ۴۱ء) جلد ۱۷، عدد ۴، ۵

باہتمام ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الکٹرک پریس لاہور میں طبع

ہو کر دفتر ترجمان القرآن واقع پونچھ روڈ مبارک پارک

لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کسی بات کے جواب میں دو قسم کے طرزِ عمل تو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں، ایک ان لوگوں کا طرزِ عمل جو اسکو صاف طور پر رد کردیں، دوسرا اُن لوگوں کا جو اسے سیدھی طرح قبول کرلیں، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اور طرزِ عمل ہے جسکو سمجھنا اور جس سے عہدہ برآ ہونا سخت مشکل ہوتا ہے، اور وہ ان لوگوں کا طرزِ عمل ہے جو اُس بات کے حق ہونے سے انکار بھی نہیں کرتے اور پھر اسکو قبول کرنیکے لیے تیار بھی نہیں ہوتے۔ یہ حضرات عموماً اس طرح کلام کی ابتدا کرتے ہیں کہ "تم جو کہتے ہو حق تو وہی ہے مگر . . . ."۔ اور یہ مگر اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اُس پورے حق کو نگل جاتا ہے جس کا اعتراف پہلے فقرے میں کیا گیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ حاضر کے ساتھ ان لوگوں کی وابستگی، اور عاجلہ سے اِن کی دلچسپی اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح اس سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکتے۔ جو کچھ اب تک کرتے رہے ہیں وہی کیے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن عقل اور ضمیر کی گواہی سے بالکل انکار کردینے کی جرأت بھی ان میں نہیں ہوتی۔ جب حق بالکل بے نقاب ہوکر سامنے ہی آن کھڑا ہو تو بھلا جانتے بوجھتے یہ برملا کیسے کہہ دیں کہ یہ حق نہیں ہے۔ لہٰذا بچاؤ کی صورت انہیں بس یہی نظر آتی ہے کہ ایک طرف حق کا اعتراف کرلیں اور دوسری طرف اُس سے گریز کرنے کے لیے دلائل و شواہد کے لشکر کے لشکر جمع کرنے کی کوشش کریں تاکہ حق کے خلاف چلنے میں ان کو برسرِ حق مان لیا جائے۔ کس قدر عجیب ہے یہ مقام! ایسے ہی لوگوں کو خطاب کرکے قرآن نے کہا تھا کہ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ؟

حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے۔ اللہ کے بندو! جب تم خود مانتے ہو کہ حق یہ ہے تو اسے چھوڑ کر جس چیز پر بھی تم چلو گے وہ باطل ہی ہو گی۔

پچھلے دنوں جن کثیر التعداد لوگوں سے بالمشافہ یا بالمراسلہ تبادلۂ خیال کا اتفاق ہوا اُن میں بعض اصحاب پہلی قسم کے تھے جنہوں نے بلا پس و پیش، یا بہت تھوڑی گفتگو کے بعد حق کو حق اور ضلال کو ضلال تسلیم کر لیا اور غلط راستوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ان سے کچھ کم تعداد میں دوسری قسم کے آدمی ملے جنہوں نے صاف طور پر کہدیا کہ یہ حق نہیں ہے، یا یہ کہ ہم اسکی تائید نہیں کر سکتے۔ لیکن مراسلہ نگاروں میں بھی اور بالمشافہ گفتگو کرنے والوں میں بھی بکثرت لوگ وہ نکلے جو قسمِ ثالث سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سب میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ ایک سانس میں جس چیز کو صحیح تسلیم کرتے ہیں دوسرے سانس میں اسی کی تردید شروع کر دیتے ہیں، مگر اس کے بعد ہر ایک کا اندازِ گریز جدا ہے اور ہر ایک کے دلائلِ گریز مختلف۔ سچ یہ ہے کہ پہلے اس بات کا پورا اندازہ تھا ہی نہیں کہ حق سے بھاگنے کے راستے اتنے بے شمار ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ اکثر حضرات نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ خود اپنے راہِ حق سے فرار کو عین حق ثابت کرتے، بلکہ اسکی بھی کوشش کی کہ جو کم بخت صحیح اور غلط کو صاف الگ الگ دیکھ رہا ہے وہ بھی اپنی آنکھیں بند کرے اور اندھوں کی ٹولی میں آشامل ہو، جو غریب صراطِ مستقیم پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ بھی کسی طرح بہکے اور انہی پگ ڈنڈیوں پر چل پڑے جن میں وہ خود بھٹک رہے ہیں۔ اسلام کا درد بھی دل میں بہت ہے۔ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ اسلامی تحریک کا اصل راستہ وہی ہے جو اِن صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے اور انبیاء علیہم السلام نے اسی ڈھنگ پر کام کیا ہے۔ مگر اللہ کے بندے ہزاروں قسم کی دنیوی و غیر دینی مصلحتوں کو حجت بنا کر نہ صرف آپ شاہراہِ مستقیم سے روگردانی کرتے ہیں بلکہ اس کا اہتمام بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کوئی اس پر چلنے نہ

پائے - ایسی ہی کچھ صورت ہوگی جب اہل کتاب سے کہا گیا ہوگا کہ یٰاَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَہَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُھَدَاءُ۔

عجیب تربات جو مشاہدہ میں آئی وہ یہ ہے کہ دینِ حق کا صحیح مفہوم اور اسے قائم کرنے کا انبیائی طریق کار جب اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا جنکو کمیونسٹ، دہریہ اور ملحد کہا جاتا ہے تو اُس نے ان میں سے بہتوں کو اپیل کیا اور اس کے مقابلہ میں اُنکے تمام ہتھیار کند ہو گئے۔ حتیٰ کہ ذی فہم غیر مسلموں تک کو ہم نے دیکھا کہ یہ چیز جب انکے آگے رکھی گئی تو وہ اپنے ان تمام تصورات پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے جو اسلام اور مسلم کے متعلق اُنکے ذہن میں جاگزیں تھے۔ لیکن اس چیز کے لیے دلوں کے دروازے اگر کہیں بند پائے گئے تو صرف اس جگہ جہاں رات دن دین وملت، دین وملت کی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر پہلے تو حیرت ہوئی، مگر جب غور کیا تو اسکی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ اس وقت دراصل اسلام کے حقیقی مقتضیات، اور مسلمانوں کے دنیوی مفاد اور تاریخی تعصبات کے درمیان پورا تعارض واقع ہو چکا ہے۔ اسلام بحیثیت ایک اصولی تحریک کے ایک راستہ کا تقاضا کرتا ہے اور مسلمانوں کے دنیوی مفاد اور تاریخی تعصبات ایک دوسرا طرزِ عمل چاہتے ہیں۔ یہ دونوں متضاد چیزیں اُس وقت تک خلط ملط رہتی ہیں جب تک اسلام کو اسکی اصلی اور اصولی نوعیت میں برسرِ کار نہیں لایا جاتا، کیونکہ اس صورت میں لوگوں کے لیے یہ موقع رہتا ہے کہ سارا کام تو اُس طرز پر کرتے رہیں جو انکے قوم پرستانہ مقاصد اور تعصبات کے لیے موزوں ہے اور دین وملت کے نام کو صرف اس لیے استعمال کریں کہ جذبات کو حرکت میں لانے اور مفاد قومی کے گرد "جمعیت اسلامیہ" کو مجتمع کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ مگر جب اسلام کو ایک تحریک کی حیثیت سے سامنے لایا جائے اور صاف صاف بتا دیا جائے کہ اس تحریک کا فطری اور منطقی راستہ کیا

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شُدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مُسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۴/- مجلد ۱/۸/- محصولڈاک -/۴/-

بجالانا سب سے پہلے ضروری ہے۔ اس کے حل سے استفادہ کرنے کے لیے کوئی شخص اسکی جماعت میں تبدیل مذہب کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ لوگ اسلام کو اُس آسانی کے ساتھ قبول کرسکینگے جسکے ساتھ وہ دوسری تحریکوں کو قبول کرتے ہیں؟

یہ شبہ بہت لوگوں کے دلوں میں ہے اور بظاہر بڑا قوی نظر آتا ہے۔ مگر فی الحقیقت نہایت کمزور ہے اور میں اس کو کوئی وزن نہیں دیتا۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے کچھ اعتقادات نہ رکھتا ہو اور جسکا ایک مخصوص فلسفہ نہ ہو۔ چند امور مابعد الطبیعت (Metaphysical problems) ایسے ہیں جنکے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہرحال ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحۂ زندگی بناتا ہو۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس لیے ہے؟ یہ دراصل زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابلِ عمل حل (Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا۔ اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کرسکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اسکے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اسکے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اسکی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کرونگا۔ یہ کمیونزم آپکے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ اس کا وجود و عدم وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اُس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے اگر اسلام یہ پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں ہے اور وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ زندگی ہے نہ حساب کتاب۔ کیا یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے نہیں ہیں؟ پھر اگر سائنٹفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور قلبی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں تو آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمدؐ رسول اللہ کی زندگی، انکی تعلیمات

اور انکے کارنامے کو دیکھ کر انکو اپنا ہادی و رہبر نہ تسلیم کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party-discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اسکی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس میں شامل ہوں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہَوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہونگے انکو یہ ہَوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دیگا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اسکی توحید کا اعتقاد، یا آخرت کا اعتقاد، یا پیغمبر کی ناقابل منازعت پیشوائی (Indisputable leadership) اور قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرطِ لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اسکی طرف کھنچ کر آنے میں سدِ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ ان کے عقائد اور ضوابط، دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں اگر اسلام ان کے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور انکی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے رکاوٹ ثابت ہو۔

البتہ اسلام کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ضرور حائل ہے اور اصلی رکاوٹ وہی ہے۔

اور اس رکاوٹ کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ اسکے پیروؤں پر ہے ۔ اس واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اور خالص اسلامی حکومت ، اسلامی اخلاق ، اور اسلامی نظام تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں ۔ پچھلی صدیوں میں مسلمان بادشاہوں نے ، مسلمان امرا نے ، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے ، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے ، اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا ۔ بلکہ اسکے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش انکے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اُس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے ۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اِس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی ، اور جماعتی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اِس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جسکی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو خود ہی انصاف سے دیکھ لیجیے کہ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اُس برتری کے منبع کی جستجو کریں ؟ اس کے برتاؤ میں ، اسکے اخلاق میں ، اسکے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کا پیرو ہے ؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا " شریف " کی نخوت اصطلاحی " کمینوں " کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم " شریف " یا رئیس سے کچھ کم ہے ؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے ؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہم سر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے ؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جنکی پیروی انکے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں ؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی

قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور وہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑے مرنا، جسکی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی اپنی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے، اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جنکے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسکو اُس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں۔ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اسکے دل کے دروازوں پر قفل چڑھا دینے کے لیے کافی نہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی زندگی کے دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر چلتے رہے ہیں، اور آج جس پالیسی پر مُصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیات اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصد اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ ایسا نہیں پا سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلّی اصول لیکر اٹھے ہیں اور انکی لڑائی محض اصول حق کی خاطر ہے۔ اسکے برعکس آپ یہ دیکھینگے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (tactics)، زبان، اصطلاحات

اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جنکے لیے ان کے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبہ پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جنکے ساتھ آپکی سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہونگے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

اس مرحلہ پر پہنچ کر ایک اور شبہ سامنے آتا ہے اور آگے بڑھنے سے پہلے اس کا صاف ہوجانا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر جہاد میں بھی تو غیر مسلموں سے کشمکش اور مقاتلہ ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز نفسیاتی اعتبار سے اسلامی تحریک کے پھیلنے میں مانع ہے تو ماننا پڑیگا کہ جہاد بھی اسلام کی راہ میں معاون ہونے کے بجائے سدِ راہ ہوتا ہے۔ پھر کیا اللہ تعالیٰ انسانی نفسیات سے بے خبر تھا کہ اس نے اپنے دین میں وہ چیز رکھی جو لوگوں کو قبول ہدایت سے روکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاد کی نوعیت نفسانی نزاع و مقاتلہ سے بالکل مختلف ہے، اسلیے اسکے اثرات و نتائج بھی اُس جنگ اور کشمکش کے اثرات و نتائج سے مختلف ہیں جو نفسانی اغراض کے لیے کی جائے۔ ایک لڑائی وہ ہے جو آپ کے اور دوسرے شخص کے درمیان اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ہو، اور دوسری لڑائی وہ ہے جو آپ اُس سے خود اُسی کے مفاد کی خاطر، اُسکی اپنی فلاح کی غرض سے لڑیں۔ ایک لڑائی اس بنیاد پر ہے کہ آپ کی اور اسکی ذاتی یا قومی اغراض متصادم ہیں اور دونوں اپنی اپنی اغراض کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اور دوسری لڑائی اس بنیاد پر ہے کہ آپ ایک شخص کو جو نادانستہ

کی وجہ سے تباہی کے راستے پر جارہا ہے، بچانا چاہتے ہیں اور اسی لیے لڑتے ہیں کہ تو اپنے آپ
کو تباہ نہ کر۔ کیا یہ دونوں لڑائیاں یکساں ہیں اور دونوں کے نتائج مساوی ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ
پہلی قسم کی لڑائی میں دونوں کے درمیان یا نفرت و عداوت بڑھیگی یا مصالحت بھی ہوئی تو منافقانہ
اور خودغرضانہ ہوگی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ کبھی ایک فریق دوسرے فریق کی دنیوی اغراض
پر ایمان لاکر اس کا ولی حمیم بن جائے، کیونکہ ایک شخص یا قوم کی دنیوی اغراض وہ چیز ہیں ہی نہیں جن
پر دوسرے شخص یا قوم کے ایمان لانے کا تصور بھی کیا جاسکتا ہو۔ بخلاف اسکے دوسری قسم کی
لڑائی میں اول اول تو فریق مقابل آپ پر یہ شبہ کریگا کہ شائد اندر کوئی چھپی ہوئی غرض ہوگی اور
جب تک یہ شبہ رہیگا وہ آپ سے لڑتا بھی رہیگا، مگر جب آپکے طرز عمل سے اس پر ثابت ہو جائیگا کہ
واقعی میرا حریف میرا دشمن نہیں ہے بلکہ سچا خیر خواہ ہے اور اپنے بھلے کے لیے نہیں بلکہ میرے ہی
بھلے کے لیے لڑ رہا ہے، تو عین لڑائی کے دوران میں اسکے دل کی کایا پلٹ ہو جائیگی اور وہ آپکا
دشمن بننے کے بجائے آپ کا عاشق بن جائیگا۔ پھر ایک دوسرا عظیم الشان فرق دونوں لڑائیوں میں
یہ ہے کہ دنیوی اغراض کی جنگ میں تو آپکی لڑائی اُس پوری قوم سے ہوگی جسکی اغراض سے آپکی
اغراض متصادم ہیں، حتیٰ کہ اسکا ایک ایک فرد آپ کی قوم کے ایک ایک فرد کا حریف مقابل بن جائیگا۔
مگر دوسری قسم کی لڑائی جو محض اصولِ حق کی خاطر لڑی جائے اُس میں ڈٹ کر آپکا مقابلہ صرف وہ
لوگ کرینگے جو پیشوائی اور خدائی کی گدّیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں یا ظالمانہ طریقوں سے ناجائز فائدے
اٹھا رہے ہیں۔ رہے عوام تو وہ صرف اس وقت تک لڑینگے جب تک اُن پر ائمۂ کفر کی ساحری کا
طلسم قائم رہیگا۔ اور جونہی اُن پر یہ منکشف ہوا کہ آپ کی لڑائی تو ظالموں کے ظلم کا خاتمہ کرنے اور
انکے پھندے کاٹنے کے لیے ہے اور اس لڑائی میں اُن کا مفاد نفس پرست پیشواؤں، جابر بادشاہوں
اور رئیسوں، اور مردم خور سرمایہ داروں کے مفاد کی عین ضد ہے، تو فوج درفوج وہ آپ کی طرف ٹوٹ

کر آئینگے اور میدان میں وہ سرداران کفر و بغی تنہا رہ جائینگے جو مغلوب و مقہور ہوئے بغیر کم ہی راہِ راست پر آتے ہیں۔ یہی صورت ابتدائے اسلام میں عرب، ایران اور شام میں پیش آئی تھی۔

پس یہ گمان کرنا کہ نفس کشمکش اور نفس مقاتلہ کسی تحریک کے پھیلنے میں سدِ راہ ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ اسکے سدِ راہ ہونے اور معاون راہ بننے کا انحصار بالکلیہ آپکے مقاصد جنگ پر ہے۔ آپ اپنے لیے لڑینگے تو اُس تحریک کے لیے پیش قدمی کے تمام راستے بند کر دینگے جسکے آپ نمائندہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور اگر بے لاگ اور خالص نیت کے ساتھ محض اپنی تحریک کے اصولوں کے لیے لڑینگے تو آپ کی لڑائی مجرب عملِ تسخیر ثابت ہوگی۔

اب اصل مبحث کی طرف پھر رجوع کیجیے۔ اسلامی تحریک کی راہ میں ایک کاوٹ تو یہ ہے جسکا اوپر ذکر ہوا۔ اور دوسری کاوٹ وہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسکو آج کل اصل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔ اس غلط مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد اور عبادات کا کوئی ربط اجتماعی نظام اور کاروبارِ حیات دنیا سے قائم نہیں رہا ہے۔ اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (Religion) کے مزعومات ( ) بنا کر رکھ دیے گئے ہیں، حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماعی اور نظام تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اسکی عبادات محض پوجا پاٹ بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیے اِن عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے جسکی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے

اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہار قدر شناسی تو کرسکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اُس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرینگے۔ تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول مقداروں کے غیر منصوص تعیّن، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کریگی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور اُنکی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا اِنہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

یہ ہیں وہ اصلی رکاوٹیں جو اسلام کو بحیثیت ایک تحریک کے اٹھنے اور پھیلنے سے روک رہی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ لوگ ان رکاوٹوں کا تجزیہ کرکے انکی حقیقی نوعیت و کیفیت کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کی فکر نہیں کرتے، بلکہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کی راہ میں شدید رکاوٹیں حائل ہیں، ان سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں، اور پھر ان سے بچ کر اسلام کی "خدمت" کرنے کے لیے عجیب عجیب نئے راستے نکالتے ہیں۔ مثلاً:

ایک راستہ بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا ہے، اور وہ اس پر بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہیں کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور اِنہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ حالانکہ یہ بدترین اور غیر معقول ترین تجویز ہے جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ کوئی صاحب نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال

نہیں کرسکتا کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اُسکے بنیادی فلسفے، اُسکے نظامِ اخلاق اور اسکے تعمیر سیرت کرنیوالے ارکان سے الگ کرکے چلایا جاسکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا نظام سیاسی آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمدؐ رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزول احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائیگی؟ پھر وہ کونسا نظامِ تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہے؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری وجوابدہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظام تمدن وسیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کرسکتے ہیں؟ پھر وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظام تمدن وسیاست کے لیے درکار ہے نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاسِ فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حُسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جڑ کے بغیر اِن شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

دوسری راہ فرار جو اپنی رکاوٹوں کی صعوبت سے مرعوب ہو کر بعض لوگوں نے نکالی ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرکے یہاں جمہوری حکومت قائم کرنے پر سارا زور صرف کیا جائے، پھر اُس جمہوری نظام میں بتدریج اسلامی طرز کا انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جائے۔

شکست خوردگی کا برا ہو۔ یہ آدمی کے دماغ کو کس بری طرح مختل کر دیتی ہے۔ اس تجویز کو ذرا تحلیل کرکے دیکھیے کہ نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ اسلامی طرز کا انقلاب جو آپ آخر کار برپا کرنا چاہتے ہیں اُس کا ماحصل تو یہی ہے نا کہ مالک الملک اللہ کے سوا اور کوئی نہ تسلیم کیا جائے اور انفرادی و اجتماعی زندگی صرف اللہ کے حدود کی پابند ہو اور حکومت وہ قائم ہو جو اللہ کے سامنے جوابدہ ہو۔ اسی کا نام دین اللہ ہے۔

لیکن اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے آپ راستہ کیا اختیار کرتے ہیں؟ یہ کہ پہلے مالک الملک انگریز کے بجائے خود باشندگان ملک قرار پائیں، انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدود انگریز کے بجائے حدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت برٹش پارلیمنٹ کے بجائے جمہور کے سامنے جواب دہ ہو، یعنی دوسرے الفاظ میں دین انگریز کی جگہ دین جمہور قائم ہو جائے۔ یہ دین جب زمین میں جڑ پکڑ لے گا تب آپ دین اللہ کو قائم کرنے کی جدوجہد شروع کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ مکہ جانے کے لیے آخر یہ ٹوکیو کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت جناب کو کس لیے پیش آئی؟ کونسی چیز آپکو براہ راست مکہ کی طرف پیش قدمی کرنے سے روکتی ہے کہ پہلے آپ ٹوکیو تشریف لے جائیں گے اور پھر وہاں سے مکہ کا قصد فرمائیں گے؟ یہ ظاہر ہے کہ دین جمہور صرف اسی صورت میں دین انگریز کو ہٹا کر اسکی جگہ لے سکتا ہے جبکہ عوام الناس کے ذہن میں خود اپنے مالک الملک ہونے کا عقیدہ اور عملاً مالک الملک بن جانے کا ارادہ شدت کے ساتھ جڑ پکڑ لے۔ بخلاف اس کے دین اللہ صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے جبکہ عوام الناس ہر دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرنے سے بھی انکار کریں، خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے بھی دست بردار ہو جائیں، اور صرف اللہ کی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب ایک ذی عقل آدمی، جس کے ہوش و حواس درست ہوں، کس طرح اس حماقت کا ارتکاب کر سکتا ہے کہ اس کا مقصد اصلی تو ہو دین اللہ کا قیام، اور اسکے لیے عملی تدبیر وہ یہ اختیار کرے کہ پہلے عوام الناس کے دل و دماغ پر خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دے کہ دین انگریز کی جڑیں اسکے زور سے اکھڑ جائیں اور دین جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ آخر دین اللہ کے نقطۂ نظر سے انگریز کی حاکمیت اور خود باشندگان ملک کی حاکمیت کے درمیان کیا فرق اور کیا وجہ ترجیح ہے؟ آخر کس معنی میں حاکمیت انگریز کی جگہ حاکمیت جمہور کا تمکن دین اللہ کے تمکن میں مددگار ہو سکتا ہے؟ اور وہ شخص جو درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں خود اپنے مالک الملک ہونے کا عقیدہ پھیلانا پھرے؟

باقی صفحہ ۳۹۹

مقالات

تجدید و احیاء دین

مجددین امت کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر

[یہ مقالہ جریدۂ "الفرقان" بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے لکھا گیا تھا اور وہیں سے شکریہ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ اسکو ملاحظہ کرتے وقت ناظرین کرام یہ بات ملحوظ رکھیں کہ اس مضمون میں تمام مجدّدین کے کارناموں کا احاطہ مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف اُن بڑے بڑے مجددین کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلام کی تاریخ پر اپنا ایک مستقل نشان چھوڑ گئے ہیں۔ نیز اس امر کا بھی خیال رکھا جائے کہ تجدید کا کام بہت لوگوں نے کیا اور ہر زمانے میں بہت لوگ کرتے ہیں، مگر "مجدّد" کا لقب پانے کے مستحق کم ہی ہوتے ہیں]

اسلام کی اصطلاحی زبان کے جو الفاظ کثرت سے زبانوں پر آتے ہیں اُن میں سے ایک لفظ "مجدّد" بھی ہے۔ اس لفظ کا ایک مجمل مفہوم تو قریب قریب ہر شخص سمجھتا ہے، یعنی یہ کہ جو شخص دین کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرے وہ مجدّد ہے، لیکن اسکے تفصیلی مفہوم کی طرف بہت کم ذہن منتقل ہوتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ تجدید (Revival) کی حقیقت کیا ہے، کس نوعیت کے کام کو "تجدید" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کام کے کتنے شعبے ہیں، مکمل تجدید کا اطلاق کس کارنامے پر ہو سکتا ہے اور جزوی تجدید کیا ہوتی ہے۔ اِسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ لوگ اُن مختلف بزرگوں کے کارناموں کی بھی پوری طرح تشخیص نہیں کر سکتے جن کو تاریخ اسلام میں مجدّد قرار دیا گیا ہے۔ وہ بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ عمر ابنِ عبدالعزیز بھی مجدّد، امام غزالی بھی

مجدد، ابنِ تیمیہ بھی مجدد، شیخ احمد سرہندی بھی مجدد اور شاہ ولی اللہ بھی مجدد۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ کون کس حیثیت سے مجدد ہے اور اس کا تجدیدی کارنامہ کس نوعیت اور کس مرتبہ کا ہے۔ اس ذھول و غفلت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جن ناموں کے ساتھ "حضرت"، "امام"، "حجتہ الاسلام"، "قطب العارفین"، "زبدۃ السالکین"، اور اسی قسم کے الفاظ لگ جاتے ہیں ان کی عقیدت مندی کا اتنا بوجھ دماغوں پر پڑ جاتا ہے کہ پھر کسی میں یہ طاقت نہیں رہتی کہ آزادی کے ساتھ ان کے کاموں کا جائزہ لیکر ٹھیک ٹھیک مشخص کر سکے کہ کس نے اس تحریک کے لیے کتنا اور کیسا کام کیا ہے، اور اس خدمت میں اُس کا حصہ کس قدر ہے۔ عموماً تحقیق کی نپی تلی زبان کے بجائے اِن بزرگوں کے کارنامے عقیدت کی شاعرانہ زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جن سے پڑھنے والے پر یہ اثر پڑتا ہے، اور شائد لکھنے والے کے ذھن میں بھی یہی ہوتا ہے، کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ مردِ کامل تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا وہ ہر حیثیت سے کمال کے آخری درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ حالانکہ اگر اب ہم کو تحریکِ اسلامی کی تجدید و احیاء کے لیے کوشش کرنی ہے تو اس قسم کی عقیدت مندی اور اس ابہام و اجمال سے کچھ کام نہ چلے گا۔ ہم کو پوری طرح اس تجدید کے کام کو سمجھنا پڑیگا اور اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہوگا کہ اِن بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتنا کتنا کام کس کس طرح کیا ہے، اُن کے کارناموں سے ہم کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور ان سے کیا کچھ چھوٹ گیا ہے جس کی تلافی پر اب ہمیں متوجہ ہونا چاہیے۔

یہ مضمون ایک مستقل کتاب چاہتا ہے۔ مگر کتاب لکھنے کی فرصت کہاں۔ یہی غنیمت ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کا ذکرِ خیر چھڑ گیا جسکی وجہ سے اس مضمون کی طرف چند اشارے کرنے کا موقع نکل آیا۔ شائد کہ اِنہی اشاروں سے کسی اللہ کے بندے کو تاریخ تجدید و احیاء دین کی تدوین کا راستہ مل جائے۔

اسلام اور جاہلیت کی اصولی و تاریخی کشمکش

تجدید کی حقیقت و نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسلام اور جاہلیت کی اصولی اور

تاریخی کشمکش کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، کیونکہ تجدید دراصل نام ہے جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کو نکال کر از سرِ نو چمکا دینے کا۔ پس آدمی نہ تو تجدید کو جان سکتا ہے نہ کسی مجدد کے کام کو پرکھ سکتا ہے جب تک کہ ان دونوں متصادم قوتوں کو اور انکی کشمکش کو واضح طور پر نہ سمجھ لے۔

دنیا میں انسان کی زندگی کے لیے جو نظام نامہ بھی بنایا جائیگا اسکی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق، جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اُسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اسکی حیثیت کیا ہے، اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، پھر اُسی نظریۂ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی، پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورتیں اختیار کرینگے، اور آخرکار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لیے جتنے مذہب و مسلک بھی بنے ہیں ان سب کو بہرحال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے اور اصول سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسلک کو دوسرے مسلک سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطۂ نظر ہے، کیونکہ ہر دستورِ زندگی کا مزاج اسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے اور یہ اس کے قالب میں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں، اور دنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے انہی چار میں سے

کسی ایک کو اختیار کیا ہے:

جاہلیت خالصہ | ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جسکے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت، اور کوئی مقصد کار فرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائیگا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر ہے تو اسکے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اسکو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اسکی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اور اپنے گردوپیش زمین کے دامن پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے جن پر وہ اپنے ان قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا اسکی زندگی کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے، اور اسکی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اسکو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو، لہذا اس کو اپنے گردوپیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہیے۔ بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جسکے سامنے انسان جوابدہ ہو، اسلیے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے، اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے، یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں۔ اسکے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ صرف اپنی نتائج کے لحاظ سے کیا جائیگا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیت محضہ کی حالت میں ہوتا ہے، یعنی جب اپنے محسوسات سے ماوراء کسی

حقیقت تک وہ نہیں پہنچتا یا بندگی نفس کی وجہ سے نہیں پہنچنا چاہتا، تو اسکے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانے میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور اربابِ حکومت نے، خوشحال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے، اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں، بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے۔ موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے۔ اگرچہ اہلِ مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادّہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو روح انکے پورے نظام تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکار خدا و آخرت اور اسی مادّہ پرستانہ اخلاق ہی کی روح ہے، اور وہ کچھ اس طرح انکی زندگی میں پیوست ہو گئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی واقعی زندگی میں دہریہ اور مادّہ پرست ہی ہیں، کیونکہ انکے علمی نظریہ کا انکی عملی زندگی سے بالفعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مترفین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی اور غرناطہ کے مترفین مسلمان ہونے کی وجہ سے خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر انکی زندگی کا سارا پروگرام اس طرح بنتا تھا کہ گویا نہ خدا ہے، نہ آخرت ہے، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ ہیں ہماری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل میں ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے کے لیے ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مہلت ملتی ہے اسکا بہترین مصرف بس یہ ہے کہ:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جیسا کہ اوپر میں نے اشارہ کیا، اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اسکی بنیاد پر ایک خالص مادّہ پرستانہ نظامِ اخلاق بنتا ہے، خواہ وہ کتابوں میں مدوّن ہو یا صرف ذہنیتوں ہی میں مرتب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظامِ تعلیم و تربیت میں الحاد و مادّیت کی روح سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں، انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ

پر مبنی ہیں، اور قوانین کا نشو ونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائیٹی میں سطح پر وہ لوگ ابھر کر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بددیانت، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں۔ تمام سوسائیٹی کی سیادت وقیادت اور مملکت کی زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ شتر بے مہار کی طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر مواخذہ سے بے پروا ہو کر خلق خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میکیاویلی (Machiavelli) کے اصول سیاست پر انکی ساری حکمت عملی بنی ہوتی ہے۔ انکی کتاب آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادّی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم مملکت کے دائرے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں۔ اور مملکت کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

جاہلیت مشرکانہ دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے، مگر اس کا ایک خداوند (Master) نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت (Scientific proof) پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اسکی بنا ہے، اسلیے موہوم، محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی والٰہیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے، نہ کبھی ہوا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنالی گئی اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، سیارے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، اور معانی مجردہ (Abstract Ideas) مثلاً محبت، حسن، شہوت، قوتِ تخلیق، بیماری، جنگ، لچھمی، اشکتی وغیرہ، اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، پرند انسان، چہار سرا، ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ مشرکین کے معبودوں میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر اس دیومالا کے گرد اوہام وخرافات (Mythology) کا ایک عجیب طلسم ہوش ربا تیار ہوا ہے جس میں ہر جاہل قوم کی قوت واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خداوند اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور

نمایاں پایا گیا ہے، وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اسکے وزیر، درباری، مصاحب، عہدہ دار اور اہلکار ہیں، مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پا سکتا اسلیے اسکے سارے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوند اعلیٰ کا تصور بہت دھندلا یا تقریباً مفقود ہے، وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیت خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی دماغی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہاں لوگ اللہ واحد قہار کی خدائی کے قائل ہو گئے، وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام تو رخصت ہو گئیں، مگر انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین، مجاذیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل اللہوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہل دماغوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر اُن نیک بندوں کو خدا بنا لیا جنکی ساری زندگیاں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہوئی تھیں۔ ایک طرف مشرکانہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارات، نیاز، نذر، عرس، صندل، چڑھاوے، نشان، علم، تعزیے، اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی ثبوتِ علمی کے ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انکے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھالوجی تیار ہو گئی جو بت پرست مشرکین کی میتھالوجی سے ہر طرح لگا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف توسل اور استمداد روحانی اور اکتسابِ فیض وغیرہ ناموں کے خوشنما پردوں میں وہ سب معاملات جو اللہ اور بندے کے درمیان ہوتے ہیں، اِن بزرگوں سے متعلق ہو گئے اور عملاً وہی حالت قائم ہو گئی جو اللہ کو ماننے والے اُن مشرکین کے ہاں ہے جنکے نزدیک پادشاہِ عالم انسان کی رسائی سے بہت دور ہے اور انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام امور نیچے کے اہلِ کاروں ہی سے وابستہ ہیں۔

فرق صرف یہ ہے کہ اُنکے ہاں یہ اہلکار علانیہ الٰہ، دیوتا، اوتار یا ابن اللہ کہلاتے ہیں، اور یہ انہیں غوث، قطب، اولیاء اور اہل اللہ وغیرہ الفاظ کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔

یہ دوسری قسم کی جاہلیت تاریخ کے دوران میں عموماً پہلی قسم کی جاہلیت، یعنی جاہلیت خالصہ کے ساتھ تعاون کرتی رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل، مصر، ہندوستان، ایران، یونان، روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدن کا بھی یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف میں اشارہ کرونگا۔

اولاً مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا کوئی تعلق اپنے معبودوں کے ساتھ اسکے سوا نہیں ہوتا کہ یہ اپنے خیال میں انکو صاحب اختیار اور نافع وضار سمجھ لیتا ہے اور مختلف مراسم عبودیت کے ذریعہ سے اپنے دنیوی مقاصد میں اُنکی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ وہاں اسکو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون و ضابطہ ملے، تو اسکا کوئی امکان ہی نہیں، کیونکہ وہاں کوئی واقع میں خدا ہو تو ہدایت اور قانون بھیجے۔ پس جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مشرک انسان لامحالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیت محضہ برسرکار آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اِسکے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے، اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اخلاق و اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں، ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ یونان قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

ثانیاً علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لیے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیت محضہ ہی کا رخ اختیار کرتا ہے اور مشرک سوسائٹی کا سارا دماغی نشوونما اُسی ڈھنگ پر ہوتا ہے جس پر خالص جاہلی سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے۔ فرق

Speculation
صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوت واہمہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اسلیے انکے افکار میں خیال آرائی کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحدہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اسلیے نرے خیالی فلسفوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انکی استدلالی کھینچ تان بھی اُتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی میتھالوجی۔ بہرحال علمی حیثیت سے شرک اور جاہلیت خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا، اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے نظریات میں قدیم یونان و روم سے اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ بیٹا ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً مشرک سوسائیٹی اُن تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہوتی ہے جنکو خالص جاہلی سوسائیٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائیٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور جاہلیت خالصہ کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے خالص جاہلی سوسائیٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریلزم، ڈکٹیٹرشپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے، اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

جاہلیت راہبانہ | تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے، انسان کی روح اس قفس عنصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل

ہیں۔ انسان اس دنیا اور اسکی چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اُتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اُسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائیگا۔ نجات کی صورت اسکے سوا کوئی نہیں ہے کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے اُن تمام محبتوں کو جو دنیوی اشیاء اور گوشت و خون کی رشتہ داریوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں، دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن، یعنی نفس و جسم کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اسکا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہوجائیگی اور نجات کے بلند مقامات پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی (Anti-social) نظریہ ہے، مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اِسکی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جسکی مختلف شکلیں ویدانتزم، اشراقیت (Neo-Platonism) یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت، اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمام تر سلبی نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جل کر لٹریچر، اعتقاد، اخلاقیات اور عملی زندگی میں نفوذ کرتی ہیں اور جہاں جہاں انکے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

پہلی دونوں قسم کی جاہلیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے:

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتی ہے اور بدترین قسم کے شریر افراد کے لیے میدان صاف ہوجاتا ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولی بن کر آزادی کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں، اور نیک لوگ اپنی نجات کی فکر میں تپسیا کیے چلے جاتے ہیں۔

(۲) اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں وہ انکے اندر غلط قسم کا صبر و تحمل، اور

مایوسانہ نقطۂ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں کے لیے نرم نوالہ بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ، امراء، اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہے ہیں، اور یہ خوب آرام سے ان کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریلزم، سرمایہ داری اور روحانی ریاست سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی لڑائی ہوئی ہو۔

(۳) جب یہ رہبانی فلسفہ و اخلاق، انسانی فطرت سے شکست کھاتا ہے تو کتاب الحیل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھول کر گناہ کیا جا سکے اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کہیں ہوس رانی کے لیے عشق مجازی کا حیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی بجھا بھی لی جائے اور تقدس بھی جوں کا توں قائم رہے۔ اور کہیں ترک دنیا کے پردے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے سانٹھ گانٹھ کی جاتی ہے اور روحانی امارت کا وہ جال پھیلایا جاتا ہے جسکی بدترین مثالیں روم کے پاپاؤں، اور مشرقی دنیا کے گدی نشینوں نے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں جب یہ گھس آتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اسکی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دنیا کو دار العمل، دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دار العذاب اور "مایا کے جال" کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطۂ نظر کے اس بنیادی تغیر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہوں بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور بھاگنا چاہیے۔ میرے لیے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کو آپریٹر کی طرح رہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے اُن سے کنارہ کروں۔ اس تصور کے ساتھ آدمی دنیا اور اسکے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بارِ خلافت سنبھالنا تو درکنار، بارِ تمدن کو بھی اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اسکے لیے پوٹا

نظام شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور اوامر و نواہی کا یہ مفہوم بالکلیہ ساقط ہو جاتا ہے کہ یہ حیات دنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اسکے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انہی کو پورے انہماک سے ٹھیک ناپ تول کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنیت نے انبیاء کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مکاشفہ، چلہ کشی و ریاضت، اور اوراد و وظائف، احزاب و اعمال، سیر مقامات اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں کے چکر میں ڈال کر مستحبات و نوافل کے التزام میں فرائض سے بھی زیادہ منہمک کر کے خلافت الٰہیہ کے اُس کام سے غافل کر دیا جسکو جاری کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے تھے۔ اور دوسرے گروہ میں تقشف، تعمق فی الدین، غلو، موشگافی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کی ناپ تول اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی، حتیٰ کہ ان کے لیے خدا کا دین ایک ایسا نازک آبگینہ بن گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیچاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہیں کچھ اونچ نیچ نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جائے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جمود، تنگ خیالی اور کم حوصلگی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں یہ قابلیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہِ جہاں بیں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دنیا کی امامت و رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

اسلام چوتھا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جسکا ایک جزء ہم خود ہیں، دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے۔ اسی نے اسکو بنایا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ سب کے سب تابع امر ہیں اور اختیارات بالکلیہ اسی ایک مالکُ فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے، یعنی رعیت ہونا

یا نہ ہونا اسکی مرضی پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔ اس نظامِ حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔ پیدائشی رعیت اور ایک جزو مملکت ہونے کی حیثیت سے اسکے لیے کوئی راستہ اسکے سوا نہیں ہے کہ جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اسکی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لیے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر امر کرتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ نہ اسکا حاکم نظر آتا ہے نہ کارپرداز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے، اس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے، اور ظاہر حواس سے کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے حساب دینا ہے۔ اعیان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت و مسئولیت (Responsibility) کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر عیاناً وحی اترتی دکھائی دے، یا کوئی ایسی صریح علامت ان کے ساتھ اترے جس کو دیکھ کر انکی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے۔ پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اسکی قدرت دیدی جاتی ہے، ذرائع بہم پہنچا دیے جاتے ہیں، اور بڑی لمبی ڈھیل دی جاتی ہے، حتیٰ کہ شرارت و عصیان کی آخری حدود کو پہنچنے تک کوئی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی۔ مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا، پوری آزادی دی جاتی ہے کہ جس جس کی بندگی

عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں (یعنی بغاوت اور بندگیٔ غیر کی صورتوں) میں رزق برابر ملتا ہے، سامان زندگی، وسائلِ کار، اسبابِ عیش حسبِ حیثیت خوب دیے جاتے ہیں، اور مرتے دم تک دیے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باغی یا کسی بندۂ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں اسباب دنیا روک لیے جائیں۔ یہ سارا طرزِ کارروائی صرف اسلیے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز، استدلال، ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اسکو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ اسکی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لیے حقیقت پر غیب کا پردہ ڈالا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے اسکی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کرکے اُس سے منہ موڑتا ہے۔ اسبابِ زندگی کا سرمایہ اور وسائل کار دیے گئے ہیں اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک کسی کارکن کو سرمایہ، وسائل، اور کام کا موقع نہ دیا جائے اسکی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اسلیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں ہے بلکہ امتحان کا سامان ہے۔ اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی عمل بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اُس قانون طبیعی کے تحت، جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، اور قابلِ اخذ یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا برا ہوگا، صرف اُس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر کرکے

بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے، یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اسکی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ (آزادی انتخاب رکھنے کے باجود) اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اسکے امر شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعاتِ عالم کی مکمل توجیہ (explanation) ہوتی ہے، کائنات کے تمام آثار (Phenomena) کی پوری تعبیر ملتی ہے اور کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظام فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے۔ کائنات اور خود وجود انسانی کے متعلق معلومات کے پورے ذخیرہ کو ایک دوسرے ڈھنگ پر مرتب کرتا ہے جو جاہلی علوم کی ترتیب سے سراسر متبائن ہے۔ ادب اور ہنر (Art & literature) کے نشوونما کا ایک الگ راستہ بناتا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متغائر ہے۔ زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خاص زاویۂ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہائے نظر سے اپنی روح اور اپنے جوہر میں کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ اخلاق کا ایک علحدہ نظام بناتا ہے جسکو جاہلی اخلاقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اسکی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیت سے قطعی مختلف ہوتی ہے اور اُسکو سنبھالنے کے لیے ایک اور ہی طرز کے نظام تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جسکے اصول جاہلیت کے ہر نظام تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے، بخلاف اسکے ہر جاہلی تہذیب کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی لیے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اسکے خط و خال اور رنگ

و روغن جاہلی تہذیب کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جزء اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔

اسکے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، لباس، خوراک، طرز زندگی، آداب اطوار، شخصی کردار، کسب معاش، صرف دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں، لین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، سول سروس کی تنظیم، قانون کے اصول، تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط، عدالت، پولیس، احتساب، مالگذاری، فینانس، امور نافعہ (Public works)، صنعت و تجارت، خبر رسانی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، فوج کی تربیت و تنظیم، جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے اور ہر ہر جزء میں ایک واضح خطِ امتیاز اسکو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔ اسکی ہر چیز میں اول سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص مقصد اور ایک خاص اخلاقی رویہ کارفرما ہوتا ہے جسکا براہ راست تعلق خدائے واحد کی حاکمیت مطلقہ، اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔

نبی کے کام کی نوعیت

اِسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام پے در پے بھیجے گئے تھے۔

رہبانی تہذیب کو مستثنیٰ کرکے ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبار دنیا کو چلانے کے لیے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اسکے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے، زمام کار اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی نظریہ و ضابطہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا محض بے معنی ہے۔ راہب تو دنیا کے معاملات

کو چلانا ہی نہیں چاہتا بلکہ ایک خاص قسم کے "سلوک" سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک باہر ہی باہر پہنچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اسلیے نہ اسکو حکومت کی حاجت نہ طلب۔ مگر جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ لیکر اٹھے اور اسی ڈھنگ میں انسان کی فلاح و سعادت کا معتقد ہو، اُسکے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کی کنجیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اپنے نقشہ پر عملدرآمد کرنیکی طاقت جب تک وہ حاصل نہ کرے، اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کاغذ پر اور ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا۔ جس تہذیب کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے، دنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے، وہی علوم و افکار اور فنون و آداب کی رہنمائی کرتی ہے، وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے، وہی تعلیم و تربیت عامہ کا انتظام کرتی ہے، اسی کے قوانین پر سارا نظام تمدن مبنی ہوتا ہے، اور اسی کی پالیسی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اُس تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمراں تہذیب کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر حکمران تہذیب عمل کی دنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اسکی طرف پھر روانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اسکے نام نہاد علم بردار اور اسکی لیڈرشپ کے بزعم خود وارثین تک تہذیب مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک معاملہ کرنے پر اتر آتے ہیں حالانکہ حکمرانی میں دو بالکل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان مقاسمت و مصالحت قطعی غیر ممکن العمل چیز ہے اور انسانی تمدن اس شرک کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بٹائی کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے اور اسکے لیے راضی ہونا ایمان اور ہمت کی کمی پر۔

پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا کہ حکومتِ الٰہیہ قائم کرکے اُس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کے لیے تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر اُنکے عمل کا اثر انہی کی ذات تک محدود رہتا ہے اُس میں اپنے جاہلی

طریقوں پر بھی چلتے رہیں۔ مگروہ انہیں یہ حق دینے کے لیے تیار نہ تھے اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کنجیاں اُنکے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیاؑ نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنیکی حد تک رہیں، جیسے حضرت ابراھیمؑ۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی اُن کا کام ختم ہو گیا جیسے حضرت مسیحؑ۔ اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین۔ فی الجملہ تمام انبیاء کے کام پر مجموعی حیثیت سے جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کام کی نوعیت یہ پائی جاتی ہے:

(۱) عام انسانوں کے اندر فکری و ذہنی انقلاب برپا کرنا۔ خالص اسلامی نقطۂ نظر و طرزِ فکر اور رویّہ اخلاقی کو انکے اندر اس حد تک پیوست کر دینا کہ انکے سوچنے کا طریقہ، زندگی کا مقصد، اقدار و قیمت کا معیار اور عمل کا ڈھنگ بالکل اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔

(۲) جو لوگ اس تعلیم و تربیت کا اثر قبول کر لیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنا کر جاہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار چھیننے کی جدوجہد کرنا اور اس جدوجہد میں تمام ان اسباب سے کام لینا جو وقت کے تمدن میں موجود ہوں

(۳) اسلامی نظامِ حکومت قائم کر کے تمدن کے تمام شعبوں کو خالص اسلام کی اساس پر مرتب کر دینا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا کہ ایک طرف اسلامی انقلاب کا دائرہ روئے زمین پر وسیع ہوتا جائے اور دوسری طرف تبلیغ اور تناسل کے ذریعہ سے جماعت اسلامی میں جتنی نئی بھرتی ہو اسکی ذہنی و اخلاقی تربیت پورے اسلامی طرز پر ہوتی رہے۔

خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں تکمیل کو پہنچا دیا۔ آپکے بعد ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما، دو ایسے کامل لیڈر اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپکے کام کو جاری رکھا۔ پھر زمامِ قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداءً چند سال

تک وہ پورا نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔

جاہلیت کا حملہ مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ، جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں، اسلیے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر اُنکی جان کی قربانی بھی اس انقلابِ معکوس (counter-revolution) کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا، ملکِ عضوض (Tyrant kingdom) نے اسکی جگہ لے لی، اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔

حکومت پر قبضہ کرنیکے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اُسکے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونیکے بعد اُسکے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے یا مشرکین، و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا مگر یہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اسکے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اُس سے عہدہ برا ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لیے آپکے ساتھ ہو جائینگے اور کوئی مسلمان علانیہ اُس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اُسکی حمایت پر کمربستہ ہو جائینگے اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالینگے۔ جاہلی امارت کی مسند

اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جسکے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کردیں اور انکے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے:

جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی پادشاہی تھی جسکو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ پادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اسلیے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانے سے وہی مطاع مطلق کی حیثیت پادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہلِ لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کردیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبیعی امر تھا کہ اسکے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہو اور علوم و فنون بھی اُسی طرز پر مرتب مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں، اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اُس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی، اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال کا مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پُرزے نکالنے لگا اور "عقائد" کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کردیئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ رقص، موسیقی اور تصویر کشی جیسے خالص جاہلی آرٹ بھی از سرِ نو اُن قوموں میں بار پانے لگے جنکو اسلام نے ان فتنوں سے بچا لیا تھا؎۔

جاہلیتِ مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستے سے ہٹا کر انکو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہوسکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ

؎ مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی جیسے لوگوں نے ان بادشاہوں کے (۶۳) ان کارناموں کو اسلامی تہذیب و تمدن کی خدمات میں شمار کیا ہے!

پایا ہو۔ پرانی جاہل قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے وہ اپنے ساتھ بہت سے مشرکانہ تصورات لیے چلے آئے اور یہاں انکو صرف اتنی تکلیف کرنی پڑی کہ پرانے معبودوں کی جگہ بزرگان اسلام میں سے کچھ معبود تلاش کریں، پرانے معبدوں کی جگہ مقابر اولیاء سے کام لیں، اور پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کریں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے انکی بڑی مدد کی اور وہ بہت سی مشکلات اُنکے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام کے اندر نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے آیات اور احادیث کو توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیاء پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکالی، مشرکانہ اعمال کے لیے اسلام کی اصطلاحی زبان میں سے الفاظ بہم پہنچائے اور اس نئی شریعت کے لیے رسموں کی ایسی صورتیں تجویز کیں کہ شرکِ جلی کی تعریف میں نہ آسکیں۔ اِس فنی امداد کے بغیر اسلام کے دائرے میں شرک بے چارہ کہاں بار پا سکتا تھا؟

جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشائخ، زہاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جنکی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا، پادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔

انہی تینوں قسم کی جاہلیتوں کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا اور پھر سے چمکا دینا وہ کام تھا جس کے لیے دین کو مجددین کی ضرورت پیش آئی۔ اگرچہ یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ اس طغیانِ جاہلیت میں اسلام بالکل ختم ہو گیا تھا اور جاہلیت کلیتہً غالب آگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں اسلام سے متاثر ہو چکی تھیں یا بعد میں متاثر ہوئیں انکی زندگیوں میں اسلام کا اصلاحی اثر تھوڑا یا بہت ضرور موجود رہا۔ جبار اور غیر ذمہ دار بادشاہوں تک میں اسلام کے اثر سے کہیں نہ کہیں خوف خدا کی جھلک نظر آہی جاتی تھی۔ جن شاہی خاندانوں میں خدائی کا رنگ جما

ہوا تھا اُنکی آغوش میں دیندار، عادل اور متقی انسان بھی پیدا ہوجاتے تھے اور وہ شاہی اختیارات رکھنے کے باوجود حتی الامکان ذمہ دارانہ حکومت کرتے تھے۔ اسی طرح امارت و ریاست کے ایوانوں میں، فلسفہ و حکمت کے مدرسوں میں، تجارت و صنعت کی کارگاہوں میں، ترک و تجرید کی خانقاہوں میں، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اپنے بالواسطہ اثرات کم و بیش برابر پہنچاتا رہا، اور عوام کے اندر بھی مشرکانہ جاہلیت کی دراندازی کے باوجود اس نے اعتقاد، اخلاق اور معاشرت میں اصلاحی اور انسدادی دونوں حیثیتوں سے اپنا نفوذ جاری رکھا جسکی وجہ سے مسلمان قوموں کا معیار اخلاقی بہرحال غیر مسلم قوموں سے ہمیشہ بلند تر رہا۔ علاوہ بریں ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی برابر موجود رہے جو اسلام کی پیروی پر ثابت قدم تھے اور اسلامی علم و عمل کو اپنی زندگی میں اور اپنے محدود حلقۂ اثر میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جو مقصدِ اصلی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا اسکے لیے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں۔ نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے، اور نہ یہ بات کافی تھی کہ چند افراد یا چند محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل بنے رہیں اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام و جاہلیت کے مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہذا دین کو ہر دور میں ایسی طاقتور شخصیتوں کی ضرورت تھی اور ہے جو زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیں، خواہ کُلاًّ یا جزءً۔ انہی شخصیتوں کا نام مجدد ہے۔

کارِ تجدید کی نوعیت

اب قبل اسکے کہ ہم مجددین امت کے کارناموں کا جائزہ لیں، ہمیں خود اس کارِ تجدید کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

عموماً لوگ تجدّد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدد کو مجدد کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیا طریقہ نکالے اور اسکو ذرا زور سے چلادے وہ مجدّد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو برسر انحطاط دیکھ کر اسکو دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کی برسرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کرکے اسلام و جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں، یا فقط نام باقی رکھ کر اُس قوم کو پوری

جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں، اُنکو مجدد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ مجدّد نہیں متجدد ہوتے ہیں، اور اُنکا کام تجدید نہیں تجدّد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔ جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا کام تجدید نہیں ہے، اور نہ اسلام و جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے، بلکہ دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزاء سے چھانٹ کر الگ کیا جائے، اور کسی نہ کسی حد تک اسکو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدّد، جاہلیت کے مقابلہ میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے، اور کسی خفیف سے خفیف جزء میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔

مجدّد نبی نہیں ہوتا مگر اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اپنا توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیرِ نو کی غیر معمولی اہلیت، اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطۂ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان تمیز کرنا، اور مدتہائے دراز کی الجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا، یہ وہ خصوصیات ہیں جنکے بغیر کوئی شخص مجدّد نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اُس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں۔

لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدّد کو نبی سے جدا کرتی ہے، یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امرِ تشریعی سے مامور ہوتا ہے، اسکو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے، اسکے پاس وحی آتی ہے، وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے، اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے، اور اسکے دعوے ہی کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر کفر و ایمان کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس اسکے مجدّد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اگر مامور بھی ہوتا ہے تو امرِ تکوینی سے نہ کہ امرِ تشریعی سے۔ بسا اوقات اسکو خود اپنے مجدّد ہونے کی خبر

نہیں ہوتی بلکہ اسکے مرنے کے بعد اسکی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اسکے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اُس پر الہام ہونا ضروری نہیں اور اگر ہوتا ہو تو لازم نہیں کہ اسے الہام کا شعور رہو۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنیکا حق رکھتا ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اگرچہ اسکے زمانہ کے تمام اہلِ خیر و صلاح رفتہ رفتہ اسکے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور صرف وہی لوگ اس سے الگ رہتے ہیں جنکی طبیعت میں کوئی ٹیڑھ ہوتی ہے مگر بہرحال اسکو ماننا مسلمان ہونے کے لیے شرط نہیں ہوتا۔ ان تمام فروق کیساتھ مجدد کو فی الجملہ اُسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے جو نبی کے کام کی نوعیت ہے۔

اس کارِ تجدید کے مختلف شعبے حسب ذیل ہیں :-

(۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، یعنی حالات کا پورا جائزہ لیکر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے، کن کن راستوں سے آئی ہے، اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں، اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے۔

(۲) اصلاح کی تجویز، یعنی یہ تعین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

(۳) خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستہ سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

(۴) ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا، نظامِ تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علوم اسلامی کا احیاء کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سرِ نو تازہ کر دینا۔

(۵) عملی اصلاح کی کوشش، یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباعِ شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا، اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

(۶) اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصولِ کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقائے تمدن

کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا، اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے تحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح ردوبدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اسکے مقاصد پورے ہوں، اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

(۷) دفاعی جدوجہد، یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

(۸) احیاء نظام اسلامی، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحبِ شریعت علیہ السلام نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش، یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں مسلمان پہلے سے موجود ہوں، اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا، بلکہ ایک ایسی طاقت ور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام انسانوں میں پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظام تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو، اور عالم انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امامت و ریاست اسلام کے ہاتھ میں آئے۔

ان شعبوں پر غائر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لیے ناگزیر ہیں جو تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی ۶ مدیں ایسی ہیں جنکا جامع ہونا مجدد ہونے کے لیے شرط نہیں ہے، بلکہ جس نے ایک، دو، تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد، جزوی مجدد ہوگا، کامل مجدد نہ ہوگا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کر دے۔

مجدد کامل کا مقام | تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ انکے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے اُن میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اِس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی لیڈر کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارے میں صاف پیشینگوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں[1]

[1] اگرچہ یہ پیشینگوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں، مگر یہاں اُس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو شاطبی نے موافقات میں اور مولانا اسماعیل شہید نے منصبِ امامت میں نقل کی ہے۔

ان اول دینکم نبوۃ ورحمۃ وتکون فیکم ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ	تمہارے دین کی ابتدا نبوت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ جل جلالہ اس کو اٹھا لیگا۔
ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ	پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تکون ملکاً عاضاً فیکون ما شاء اللہ ان یکون ثم یرفعہ اللہ جل جلالہ	پھر بداطوار بادشاہی ہوگی اور جو کچھ اللہ چاہے گا وہ ہوگا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تکون ملکاً جبریۃ فتکون ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ	پھر جبر کی فرمانروائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہیگا رہیگی۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھا لیگا۔
ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ تعمل فی الناس بسنۃ النبی ویلقی الاسلام بجرانہ فی	پھر وہی خلافت بطریق نبوت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کریگی اور اسلام زمین میں پاؤں جمائیگا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو سُن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مردِ کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قوائے عمل کو سرد کر دیا ہے، اسلیے ان کی رائے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لیکر جاہل لوگ بے عمل ہو جائیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہیے نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مردے از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ محض ایک وہم ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح پچھلے انبیاء نے بھی اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نوعِ انسان کی دنیوی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک دفعہ اسلام ساری دنیا کا دین بنے گا، اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخر کار تباہیوں کا مارا ہوا انسان اُس "ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم الشان لیڈر کی بدولت نصیب ہو گی جو انبیاء کے طریقہ پر کام کر کے اسلام کو اسکی صحیح صورت میں پوری طرح نافذ کر دیگا،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ - الارض یرضی عنها ساکن السماء وساکن الارض لا تدع السماء من قطرہا الا صبتہ مدرارًا ولا تدع الارض من نباتہا و برکاتہا شیئاً الا اخرجتہ

اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اِسناد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنیً یہ ان تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اسی معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مرحلوں کی طرف صاف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گذر چکے ہیں اور چوتھا اب گذر رہا ہے۔ آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشینگوئی کی گئی ہے تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اسکی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے "ازم" آزمائے جا چکے ہیں اور بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تھک ہار کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔

تو آخر اس میں وہم کی کونسی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور جہالت نے اسکی روح نکال کر اوہام کے لبادے اسکے گرد لپیٹ دیے ہوں۔

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی اُن متجددین سے جو اسکے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہونگے، تسبیح ہاتھ میں لیے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہونگے، آتے ہی انا المہدی کا اعلان کرینگے، علماء اور مشائخ کتابیں لیے ہوئے پہنچ جائینگے اور لکھی ہوئی علامتوں سے انکے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کرینگے، پھر بیعت ہوگی اور اعلان جہاد کر دیا جائیگا، چِلّے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" انکے جھنڈے تلے جمع ہونگے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلانی پڑیگی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے چلیگا، پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائینگے، جس کافر پر نظر ماردینگے تڑپ کر بے ہوش ہوجائیگا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائینگے۔ عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اسکو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی، زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا، عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جماویگا، اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسکی "جدتوں" کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کرینگے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اسکی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائیگا۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کریگا، بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اسکی

موت کے بعد اسکے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جسکی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مہدی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اُسکے کام میں کرامات و خوارق، کشوف و الہامات، اور چلّوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک "انقلابی لیڈر" کو دنیا میں جس طرح شدید جدوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے مہدی کو بھی گذرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (School of thought) پیدا کریگا، ذہنیتوں کو بدلے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائیگا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اسکو کچلنے کی کوشش کریگی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی، اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہنچ جائیگی جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ "اس حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہونگے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کریگا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دیگی"۔

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے ایک عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جسکی ہمہ گیر و پرزور قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوگا۔ جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سُن کر حیرت ہوتی ہے مجھے انکی عقل پر حیرت ہوتی ہے جب خدا کی اس خدائی میں لینن اور ہٹلر جیسے ائمۂ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا

ظہور کیوں مستبعد ہو؟

جزوی مجددین اور ان کا کام تاریخی ترتیب کو چھوڑ کر مستقبل کے مجدد اعظم کا ذکر میں نے پہلے اسلیے کر دیا کہ لوگ پہلے مجدد کامل کے مرتبہ و مقام سے واقف ہو جائیں تاکہ کمال مطلوب کے مقابلہ میں انکے لیے جزوی تجدیدوں کے مرتبہ و مقام کا اندازہ کرنا آسان ہو جائے۔ اب میں ایک مختصر نقشہ اس تجدیدی کام کا پیش کرونگا جو اب تک انجام پا چکا ہے۔

عمر ابن عبد العزیز

اسلام کے سب سے پہلے مجدد عمر ابن عبد العزیز[1] ہیں۔ شاہی خاندان میں آنکھ کھولی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے باپ کو مصر جیسے عظیم الشان صوبہ کا گورنر پایا۔ بڑے ہوئے تو خود اموی سلطنت کے ماتحت گورنری پر مامور ہوئے۔ شاہان بنی امیہ نے جن جاگیروں سے اپنے خاندان کو مالامال کیا تھا اُن میں ان کا اور ان کے گھرانے کا بھی بہت بڑا حصہ تھا، حتیٰ کہ خاص انکی ذاتی جائداد کی آمدنی پچاس ہزار اشرفی سالانہ تک پہنچتی تھی۔ رئیسوں کی طرح پوری شان سے رہتے تھے۔ لباس، خوراک، سواری، مکان، عادات و خصائل سب وہی تھے جو شاہی حکومت میں شاہزادوں کے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا ماحول اُس کام سے دور کی مناسبت بھی نہ رکھتا تھا جو بعد میں انہوں نے انجام دیا۔ لیکن انکی ماں حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پچاس ہی برس ہوئے تھے جب وہ پیدا ہوئے۔ انکے زمانہ میں صحابہ اور تابعین بکثرت موجود تھے۔ ابتدا میں انہوں نے حدیث اور فقہ کی پوری تعلیم پائی تھی یہاں تک کہ محدثین کی صف اول میں شمار ہوتے تھے اور فقہ میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ پس علمی حیثیت سے تو اُن کے لیے یہ جاننے اور سمجھنے میں کوئی دقت نہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین مہدیین کے عہد میں تمدن کی اساس کن چیزوں پر تھی اور جب خلافت پادشاہی سے بدلی تو ان بنیادوں میں کس نوعیت کا تغیر واقع ہوا۔ البتہ جو چیز عملی حیثیت سے اُن کے راستے میں رکاوٹ ہو سکتی تھی وہ یہ تھی کہ اس جاہلی انقلاب کا بانی خود ان کا اپنا خاندان تھا، اُس کے تمام فائدے اور سب عدو حسنات

[1] سنہ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

فائدے انکے بھائی بندوں اور خود اُن کی ذات اور انکے بال بچوں کو پہنچتے تھے، اور انکی خاندانی عصبیت، ذاتی طمع اور اپنی آئندہ نسل کی دنیوی خیر خواہی کا پورا تقاضا یہ تھا کہ وہ بھی تختِ شاہی پر فرعون بن کر بیٹھیں، اپنے علم اور ضمیر کو ٹھوس مادی فائدوں کے مقابلہ میں قربان کریں اور حق، انصاف، اخلاق اور اصول کے چکر میں نہ پڑیں۔ مگر جب ۳۷ سال کی عمر میں بالکل اتفاقی طور پر تختِ شاہی ان کے حصہ میں آیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ کس قدر عظیم الشان ذمہ داری ان پر آپڑی ہے تو دفعتہً انکی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ انہوں نے اس طرح کسی ادنیٰ تامل کے بغیر جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کے راستے کو اپنے لیے منتخب کیا کہ گویا یہ ان کا پہلے سے سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا۔

تخت شاہی انہیں خاندانی طریق پر ملا تھا مگر بیعت لیتے وقت مجمع عام میں صاف کہہ دیا کہ میں اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، تم لوگ جسکو چاہو خلیفہ منتخب کرلو۔ اور جب لوگوں نے برضا و رغبت کہا کہ ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں، تب انہوں نے خلافت کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔

پھر شاہانہ کروفر، فرعونی انداز، قیصر و کسریٰ کے درباری طریقے، سب رخصت کیے اور پہلے ہی روز لوازم شاہی کو ترک کرکے وہ طرز اختیار کیا جو مسلمانوں کے درمیان اُن کے خلیفہ کا ہونا چاہیے۔

اسکے بعد ان امتیازات کی طرف توجہ کی جو شاہی خاندان کے لوگوں کو حاصل تھے اور انکو تمام حیثیتوں سے عام مسلمانوں کے برابر کردیا۔ وہ تمام جاگیریں جو شاہی خاندان کے قبضہ میں تھیں، اپنی جاگیر سمیت بیت المال کو واپس کیں۔ جن جن کی زمینوں اور جائدادوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا وہ سب ان کو واپس دیں۔ انکی اپنی ذات کو اس تغیر سے جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ پچاس ہزار کی جگہ صرف دوسو اشرفی سالانہ کی آمدنی رہ گئی ـــــ بیت المال کے روپے کو اپنی ذات پر اور اپنے خاندان والوں پر حرام کردیا حتیٰ کہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تنخواہ تک نہ لی۔ اپنی زندگی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ یا تو خلیفہ ہونے

سے پہلے شاہانہ شان کے ساتھ رہتے تھے۔ یا خلیفہ ہوتے ہی فقیر بن گئے۔

گھر اور خاندان کی اس اصلاح کے بعد نظام حکومت کی طرف توجہ کی۔ ظالم گورنروں کو الگ کیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر صالح آدمی تلاش کیے کہ گورنری کی خدمت انجام دیں۔ عاملین حکومت، جو قانون اور ضابطہ سے آزاد ہو کر رعایا کی جان، مال، آبرو پر غیر محدود اختیارات کے مالک ہو گئے تھے، انکو پھر ضابطہ کا پابند بنایا اور قانون کی حکومت قائم کی۔ ٹیکس عائد کرنے کی پوری پالیسی بدل دی، اور وہ تمام ناجائز ٹیکس جو شاہانِ بنی امیہ نے عائد کر دیے تھے، جن میں آبکاری تک کا محصول شامل تھا، یک قلم موقوف کیے۔ زکوٰۃ کی تحصیل کا انتظام از سرِ نو درست کیا اور بیت المال کی دولت کو پھر سے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو ناانصافیاں کی گئی تھیں اُن سب کی تلافی کی، اُن کے معابد جن پر ناجائز قبضہ کیا گیا تھا انہیں واپس دلائے، انکی زمینیں جو غصب کر لی گئی تھیں پھر واگذاشت کیں اور انکے تمام وہ حقوق بحال کیے جو شریعت کی رو سے انہیں حاصل ہیں۔ عدالت کو انتظامی حکومت کے دخل سے آزاد کیا اور حکم بین الناس کے ضابطہ اور اسپرٹ دونوں کو شاہی نظام کے اثرات سے پاک کر کے اسلامی اصول پر قائم کر دیا۔ اس طرح حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے ہاتھوں سے اسلامی نظامِ حکومت دوبارہ زندہ ہوا۔

پھر انہوں نے سیاسی اقتدار سے کام لے کر لوگوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی سے جاہلیت کے اُن اثرات کو نکالنا شروع کیا جو نصف صدی کی جاہلی حکومت کے سبب سے اجتماعی زندگی میں پھیل گئے تھے۔ فاسد عقیدوں کی اشاعت کو روکا۔ عوام کی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم کی طرف اہل دماغ طبقوں کی توجہات کو دوبارہ منعطف کیا اور ایک ایسی علمی تحریک پیدا کر دی جسکے اثر سے اسلام کو ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد ابن حنبل جیسے مجتہدین میسر آئے۔ اتباعِ شریعت کی روح کو تازہ کیا۔ شراب نوشی، تصویر کشی اور عیش و تنعم کی بیماریاں جو شاہی نظام کی بدولت پیدا ہو چکی تھیں، ان کا انسداد کیا، اور فی الجملہ وہ مقصد پورا کیا جس کے لیے اسلام اپنی حکومت قائم کرنا

چاہتا ہے، یعنی اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ -

بہت ہی قلیل مدت میں اس انقلابِ حکومت کے اثرات عوام کی زندگی پر اور بین الاقوامی حالات پر مترتب ہونے شروع ہو گئے۔ ایک راوی کہتا ہے کہ ولید کے زمانے میں لوگ جب آپس میں بیٹھتے تو عمارات اور باغوں کے متعلق گفتگو کرتے۔ سلیمان بن عبد الملک کا زمانہ آیا تو عوام کا مذاق صنفی معاملات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر جب عمر ابنِ عبد العزیز حکمراں ہوئے تو حالت یہ تھی کہ جہاں چار آدمی جمع ہوئے نماز اور روزہ اور قرآن کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ غیر مسلم رعایا پر اس حکومت کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ ہزار در ہزار آدمی اس مختصر سی مدت میں مسلمان ہو گئے اور جزیہ کی آمدنی دفعتہً اتنی گھٹ گئی کہ سلطنت کے مالیات اس سے متاثر ہو گئے۔ مملکت اسلامی کے اطراف میں جو غیر مسلم ریاستیں موجود تھیں، حضرت عمر ابن عبد العزیز نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور ان میں سے متعدد ریاستوں نے اس دین کو قبول کر لیا۔ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی حریف سلطنت اس وقت روم کی سلطنت تھی جس کے ساتھ ایک صدی سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اُس وقت بھی سیاسی کشمکش چل رہی تھی۔ مگر عمر ابنِ عبد العزیز کا جو اخلاقی اثر روم پر قائم ہوا اس کا اندازہ اُن الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو ان کے انتقال کی خبر سُن کر خود قیصرِ روم نے کہے تھے۔ اس نے کہا کہ:

> ”اگر کوئی راہب دنیا کو چھوڑ کر اپنے دروازے بند کرے اور عبادت میں مشغول ہو جائے تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مگر مجھے حیرت ہے تو اس شخص پر جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی اور پھر اسے ٹھکرا کر اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔“

اسلام کے اس مجدّدِ اوّل کو صرف ڈھائی سال کام کرنے کا موقع ملا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے یہ انقلابِ عظیم برپا کر کے دکھا دیا۔ بنی امیہ کا پورا خاندان اس بندۂ خدا کا دشمن ہو گیا تھا۔ اسلام کی

زندگی میں اُن لوگوں کی موت تھی، وہ اس تجدید کے کام کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ آخر کار انہوں نے سازش کر کے زہر دیدیا اور صرف ۳۹ سال کی عمر میں یہ خادمِ دین وملت دنیا سے رخصت ہو گیا۔ جس کارِ تجدید کو اس نے شروع کیا تھا، اسکی تکمیل میں اب صرف اتنی کسر باقی تھی کہ خاندانی حکومت کو ختم کر کے انتخابی خلافت کا سلسلہ پھر سے قائم کر دیا جاتا۔ یہ اصلاح اسکے پیشِ نظر تھی، اور اپنے عندیہ کا اس نے اظہار بھی کر دیا تھا، مگر اُموی اقتدار کی جڑوں کو اجتماعی زندگی سے اکھاڑنا اور عام مسلمانوں کی اخلاقی و ذہنی حالت کو خلافت کا بار سنبھالنے کے لیے تیار کرنا اتنا آسان کام نہ تھا کہ ڈھائی برس کے اندر انجام پا سکتا۔

ائمہ اربعہ

عمرِ ثانی کی وفات کے بعد اگرچہ سیاسی اقتدار کی کنجیاں پھر اسلام سے جاہلیت کی طرف منتقل ہو گئیں اور سیاسی پہلو میں اُس پورے کام پر پانی پھر گیا جو انہوں نے انجام دیا تھا، مگر اسلامی ذہنیت میں جو بیداری انہوں نے پیدا کر دی تھی اور جس علمی حرکت کو وہ اُکسا گئے تھے اُسے کوئی طاقت بار آور ہونے سے نہ روک سکی۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے کوڑے اور اشرفیوں کے توڑے، دونوں ہی اسکے راستے میں حائل ہوئے، مگر کسی کی بھی اس کے آگے پیش نہ چلی۔ اِس تحریک کے اثر سے قرآن و حدیث کے علوم میں تحقیق، اجتہاد اور تدوین کا بہت بڑا کام ہوا، اصولِ دین سے اسلام کے قوانین کی تفصیلی شکل مرتب کی گئی اور ایک وسیع نظام تمدن کو اسلامی طرز پر چلانے کے لیے جس قدر ضوابط و مناہج عمل کی ضرورت تھی وہ تقریباً سارے کے سارے اپنے تمام جزئیات کے ساتھ مدون کر ڈالے گئے۔ دوسری صدی کے آغاز سے تقریباً چوتھی صدی تک یہ کام پوری قوت کے ساتھ چلتا رہا۔

اس دور کے مجددین وہ چار بزرگ ہیں[1] جنکی طرف آج فقہ کے چاروں مذاہب منسوب ہیں۔ اگرچہ مجتہد انکے سوا اور بھی کثیر التعداد اصحاب تھے۔ مگر جس لحاظ سے اِن حضرات کا مقام مجتہدین سے بلند ہو کر مجددین کے مرتبہ تک

[1] امام ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ امام مالک ۹۵ھ میں پیدا ہوئے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ امام شافعی ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ امام احمد ابن حنبل ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔

پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ:

اوّلاً ان حضرات نے اپنی گہری بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت و ذہانت سے ایسے مذاہب فکر پیدا کیے جنکی زبردست طاقت سات آٹھ صدیوں تک مجتہد پیدا کرتی رہی۔ انہوں نے کلیات دین سے جزئیات مستنبط کرنے اور اصول شرع کو زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کے ایسے وسیع وہمہ گیر طریقے قائم کر دیے کہ آگے چل کر جس قدر اجتہادی کام ہوا انہی کے طریقوں پر ہوا اور آئندہ بھی جب کبھی اس سلسلہ میں کوئی کام ہوگا انکی رہنمائی سے انسان بے نیاز نہ ہو سکے گا۔

ثانیاً ان لوگوں نے یہ سارا کام شاہی نظام حکومت کی امداد کے بغیر، اسکی مداخلت سے بالکل آزاد ہو کر، بلکہ اسکی دراندازیوں کا سخت مقابلہ کر کے انجام دیا اور اس سلسلہ میں وہ وہ تکلیفیں اٹھائیں جنکے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ میں کوڑوں کی مار اور قید کی سزائیں بھگتیں یہاں تک کہ زہر سے ان کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔ امام مالک کو منصور عباسی کے زمانے میں کوڑوں کی سزا دی گئی اور اس بری طرح انکی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گیا۔ امام احمد ابن حنبل پر مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانے میں مسلسل مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، اتنا اتنا مارا گیا کہ شائد اونٹ اور ہاتھی بھی اس مار کی تاب نہ لاسکیں، اور پھر متوکل کے زمانہ میں شاہی انعام و اکرام اور عقیدت و تعظیم کی وہ بارش اُن پر کی گئی کہ گھبرا کر پکار اٹھے کہ ھذا امر اشد علی من ذالک (یہ مجھ پر اُس مار اور قید سے زیادہ سخت مصیبت ہے) مگر ان سب باتوں کے باوجود ان اللہ کے بندوں نے علم دین کی ترتیب و تدوین میں نہ صرف خود شاہی نفوذ و اثر کو گھسنے کا راستہ نہ دیا بلکہ کچھ ایسی طرح ڈال گئے کہ انکے بعد بھی سارا اجتہادی و تدوینی کام درباروں کے دخل سے بالکل آزاد ہی رہا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اسلامی قوانین اور علوم حدیث و قرآن کا جتنا معتبر و مستند ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ جاہلیت کے ادنیٰ شائبہ سے بھی ملوّث نہیں ہوا ہے۔ یہ چیزیں ایسی پاک صاف صورت میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئی ہیں کہ صدیوں تک بادشاہوں اور امراء کی نفس

پرستیوں اور عوام کے اخلاقی تنزل اور اعتقادی و تمدنی گمراہیوں کا جو دور دورہ رہا وہ گویا ان علوم کے لیے معدوم محض تھا۔ اس کا کوئی اثر ان علوم پر نہیں پایا جاتا۔

امام غزالی

عمر ابن عبدالعزیز کے بعد سیاست و حکومت کی باگیں مستقل طور پر جاہلیت کے ہاتھوں میں چلی گئیں، اور بنی امیہ، بنی عباس اور پھر ترکی النسل پادشاہوں کا اقتدار قائم ہوا۔ ان حکومتوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف یونان، روم اور عجم کے جاہلی فلسفوں کو جوں کا توں لیکر مسلمانوں میں پھیلادیا، اور دوسری طرف علوم و فنون اور تمدن و معاشرت میں جاہلیت اولی کی تمام گمراہیوں کو اپنی دولت اور طاقت کے زور سے شائع و ذائع کیا۔ عباسی خاندان کے تنزل نے مزید نقصان یہ پہنچایا کہ ابتدائی عباسی خلفاء کے بعد دنیوی اقتدار کی باگیں جن لوگوں کے ہاتھوں میں آئیں وہ علوم دینی سے بالکل ہی کورے تھے۔ ان میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ قضا اور افتاء کے عہدوں کے لیے اہل آدمیوں کو منتخب کر سکتے۔ اپنی جہالت اور سہولت پسندی کی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کی تنفیذ کا کام ایسے لگے بندھے طریقوں پر کرنا چاہتے تھے جن میں کسی کدو کاوش کی ضرورت نہ ہو، اور اسکے لیے تقلید جامد ہی کا راستہ موزوں تھا۔ مزید براں دنیا پرست علماء نے انکو مذہبی مناظروں کی چاٹ بھی لگادی، اور پھر شاہی سرپرستی میں یہ مرض اتنا پھیلا کہ اس نے تمام مسلم ممالک میں فرقہ بندی، اختلاف اور سرپھٹول کی وبا پھیلادی۔

پانچویں صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ حال ہو گیا کہ:

(۱) یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔ محدثین و فقہاء علوم عقلیہ سے ناواقف تھے اسلیے نظام دین کو مقتضائے زمانہ کے مطابق معقولی انداز سے سمجھا نہ سکتے تھے اور زجر و توبیخ سے اعتقادی گمراہیوں کو دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ علوم عقلیہ میں جن لوگوں کے کمال کا شہرہ تھا وہ نہ صرف یہ کہ علوم دینیہ میں کوئی بصیرت نہ رکھتے تھے، بلکہ فلاسفۂ یونان کے بالکل غلام تھے اور ان میں کوئی ایسا بالغ النظر

آدمی نہ تھا جو تنقید کی نگاہ سے اس یونانی لٹریچر کا جائزہ لیتا۔ متکلمین کا جو گروہ اسلام کی "حمایت" کے لیے اٹھا اُس نے وہی یونانی کو تو اٹل سمجھ کر جوں کا توں تسلیم کر لیا، اور وحی آسمانی کو توڑنا اور مروڑنا شروع کیا تاکہ اس کے مطابق ڈھل جائے۔ ان حالات کا عام مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ دین کو ایک غیر معقول چیز سمجھنے لگے، اسکی ہر چیز انہیں مشکوک نظر آنے لگی اور ان میں یہ خیال جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ ہمارا دین ایک چھوئی موئی کا درخت ہے جو عقلی امتحان کی ایک ذرا سی ٹھیس سے مرجھا جاتا ہے۔ امام ابوالحسن اشعری اور انکے متبعین نے اس رو کو بدلنے کی کوشش کی مگر یہ گروہ متکلمین کے علوم سے تو واقف تھا، لیکن معقولات کے گھر کا بھیدی نہ تھا، اسلیے وہ اس عام بے اعتقادی کی رفتار کو بدلنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، بلکہ معتزلہ کی ضد میں اس نے بعض ایسی باتوں کا التزام کر لیا جو فی الواقع عقائدِ دین میں سے نہ تھیں۔

(۲) جاہل فرمانرواؤں کے اثر سے، اور علوم دینی کو مادّی وسائل کی تائید بہم پہنچنے کے سبب سے اجتہاد کے چشمے خشک ہو گئے، تقلیدِ جامد کی بیماری پھیل گئی، مذہبی اختلافات نے ترقی کر کے ذرا ذرا سے جزئیات پر نئے نئے فرقے پیدا کر دیے، اور ان فرقوں کی باہمی لڑائیوں سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا علےٰ شفا حفرۃ من النار ہیں۔

(۳) مشرق سے مغرب تک مسلم ممالک میں ہر طرف اخلاقی انحطاط رونما ہو گیا جسکے اثر سے کوئی طبقہ خالی نہ رہا۔ قرآن اور نبوت کی روشنی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی بڑی حد تک خالی ہو گئی۔ علماء، امراء، عوام، سب بھول گئے کہ خدا کی کتاب اور رسول کی سنت بھی کوئی چیز ہے جسکی طرف ہدایت و رہنمائی کے لیے کبھی رجوع کرنا چاہیے۔

(۴) شاہی درباروں، خاندانوں، اور حکمران طبقوں کی عیاشانہ زندگی اور خود غرضانہ لڑائیوں کی وجہ سے عموماً رعایا تباہ حال ہو رہی تھی۔ ناجائز ٹیکسوں کے بار نے معاشی زندگی کو نہایت خراب کر دیا تھا۔ تمدن کو حقیقی فائدہ پہنچانے والے علوم و صنائع روبہ تنزل تھے اور اُن فنون کا زور تھا جو شاہی درباروں

میں قدر و منزلت رکھتے تھے مگر اخلاق و تمدن کے لیے غارت گر تھے۔ آثار سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عام تباہی کا وقت قریب آ لگا ہے۔

یہ حالات تھے جب پانچویں صدی کے وسط میں امام غزالی پیدا ہوئے۔[1] انہوں نے ابتداءً اسی طرز کی تعلیم حاصل کی جو اس زمانہ میں دنیوی ترقی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ انہی علوم میں کمال پیدا کیا جنکی بازار میں مانگ تھی۔ پھر اس جنس کو لیکر وہیں پہنچے جہاں کے لیے تیار ہوئے تھے اور اُن بلند ترین مراتب تک ترقی کی جن کا تصور اُس زمانہ میں کوئی عالم کر سکتا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ـــ نظامیۂ بغداد ـــ کے ریکٹر مقرر ہوئے۔ نظام الملک طوسی، ملک شاہ سلجوقی اور "خلیفۂ" بغداد کے درباروں میں اعتماد حاصل کیا۔ وقت کے سیاسیات میں یہاں تک دخیل ہو گئے کہ سلجوقی فرمانروا اور عباسی "خلیفہ" کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوتے تھے ان کو سلجھانے کے لیے اِنکی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ دنیوی عروج کے اس نقطہ پر پہنچ جانے کے بعد انکی زندگی میں انقلاب رونما ہوا۔ اپنے زمانہ کی علمی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور تمدنی زندگی کو جتنی گہری نظر سے دیکھتے گئے اسی قدر اُنکے اندر بغاوت کا جذبہ ابھرتا چلا گیا، اور اسی قدر ان کے ضمیر نے زیادہ زور سے صدا لگانی شروع کی کہ تم اس گندے سمندر کی شناوری کے لیے نہیں ہو بلکہ تمہارا فرض کچھ اور ہے۔ آخر کار اُن تمام اعزازات اور فوائد و منافع اور مشاغل پر لات مار کر جنکے جنجال میں پھنسے ہوئے تھے، فقیر بن کر سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے، گوشوں اور ویرانوں میں رہ کر غور و خوض کیا، چل پھر کر عام مسلمانوں کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا، اور مجاہدات و ریاضات سے اپنی روح کو صاف کرتے رہے۔ ۳۸ سال کی عمر میں نکلے تھے، پورے دس برس کے بعد ۴۸ سال کی عمر میں واپس ہوئے، اور اس طویل غور و فکر و مشاہدہ کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہوں کے تعلق اور انکی وظیفہ خواری سے توبہ کی، جدال و تعصب سے پرہیز کرنے کا دائمی عہد کیا، اُن تعلیمی ادارات میں کام کرنے سے انکار کر دیا جو سرکاری اثر میں ہوں، اور طوس میں خود اپنا ایک آزاد ادارہ قائم کیا۔ اس ادارہ میں وہ چیدہ افراد کو اپنے خاص طرز پر تعلیم و تربیت دے کر تیار کرنا چاہتے تھے، مگر غالباً انکی یہ

[1] ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

کوشش کوئی بڑا انقلاب انگیز کام نہ کرسکی کیونکہ پانچ چھ سال سے زیادہ انکو اس طرزِ خاص پر کام کرنیکی اجل ہی نے مہلت نہ دی۔

امام غزالی کے تجدیدی کام کا خلاصہ یہ ہے:

اولاً، انہوں نے فلسفۂ یونان کا نہایت گہرا مطالعہ کرکے اس پر تنقید کی اور اتنی زبردست تنقید کی کہ وہ رعب جو مسلمانوں پر چھا گیا تھا، کم ہو گیا اور لوگ جن نظریات کو حقائق سمجھے بیٹھے تھے، جن پر قرآن و حدیث کی تعلیمات کو منطبق کرنیکے سوا دین کے بچاؤ کی کوئی صورت انہیں نظر نہ آتی تھی، اُنکی اصلیت سے بڑی حد تک آگاہ ہو گئے۔ امام کی اس تنقید کا اثر مسلم ممالک ہی تک محدود نہ رہا بلکہ یورپ تک پہنچا اور وہاں بھی اس نے فلسفۂ یونان کے تسلط کو مٹانے اور جدید دورِ تنقید و تحقیق کا فتح باب کرنے میں حصہ لیا۔

ثانیاً، انہوں نے ان غلطیوں کی اصلاح کی جو فلاسفہ و متکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حمایتی کر رہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ اُسی قسم کی حماقتیں کر رہے تھے جو بعد میں یورپ کے پادریوں نے کیں، یعنی مذہبی عقائد کے اثبات کو بعض مرتبہ غیر معقول باتوں پر موقوف سمجھ کر خواہ مخواہ اُن کو اصول موضوعہ قرار دے لیتے اور ان کو بھی عقائدِ دین میں داخل کرکے ہر اُس شخص کی تکفیر کرتے جو ان باتوں کا قائل نہ ہو، اور ہر اس برھان یا تجربہ یا مشاہدہ کو دین کیلیے خطرہ سمجھتے جس سے اُنکے مزعومات کی غلطی ثابت ہوتی ہو۔ اسی چیز نے یورپ کو بالآخر دہریت کی طرف دھکیل دیا۔ مگر مسلم ممالک میں امام غزالی نے بروقت اسکی اصلاح کی اور مسلمانوں کو بتایا کہ تمہارے عقائدِ دینی کا اثبات ان غیر معقولات کے التزام پر منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے معقول دلائل موجود ہیں، لہٰذا ان چیزوں پر اصرار فضول ہے۔

ثالثاً، انہوں نے اسلام کے عقائد اور اساسیات (Fundamentals) کی ایسی معقول تعبیر پیش کی جس پر کم از کم اُس زمانہ کے اور بعد کی کئی صدیوں تک کے معقولات کی بنا پر کوئی اعتراض نہ ہوسکتا تھا۔ اس کے ساتھ احکامِ شریعت اور عبادات و مناسک کے اسرار و مصالح بھی بیان کیے اور دین کا ایک ایسا

تصور لوگوں کے سامنے رکھا جس سے وہ غلط فہمیاں دور ہو گئیں جنکی بنا پر پہلے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ اسلام عقلی امتحان کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔

رابعاً، انہوں نے اپنے وقت کے تمام مذہبی فرقوں اور انکے اختلافات پر نظر ڈالی اور پوری تحقیق کے ساتھ بتایا کہ اسلام اور کفر کی امتیازی سرحدیں کیا ہیں، کن حدود کے اندر انسان کے لیے رائے و تاویل کی آزادی ہے، اور کن حدود سے تجاوز کرنے کے معنی اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔ اسلام کے اصلی عقائد کون سے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جنکو خواہ مخواہ عقائد دین میں داخل کر لیا گیا ہے۔ اس تحقیقات نے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور تکفیر بازی کرنے والے فرقوں کی سرنگوں سے بہت سی بارود نکال دی اور لوگوں کے زاویۂ نظر میں وسعت پیدا کی۔

خامساً، انہوں نے دین کے فہم کو تازہ کیا، بے شعوری کی مذہبیت کو فضول ٹھیرایا، تقلید جامد کی سخت مخالفت کی، لوگوں کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے چشمۂ فیض کی طرف پھر سے توجہ دلائی، اجتہاد کی روح کو تازہ کرنے کی کوشش کی، اور اپنے عہد کے تقریباً ہر گروہ کی گمراہیوں اور کمزوریوں پر تنقید کر کے اصلاح کی طرف عام دعوت دی۔

سادساً، انہوں نے اس نظام تعلیم پر تنقید کی جو بالکل فرسودہ ہو چکا تھا اور تعلیم کا ایک نیا نظام تجویز کیا۔ اس وقت تک مسلمانوں میں جو نظام تعلیم قائم تھا اس میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ علوم دنیا اور علوم دین الگ الگ تھے اور اسکا نتیجہ لامحالہ تفریق دنیا و دین کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے شرعی علوم کی حیثیت سے بعض ایسی چیزیں داخل درس تھیں جو شرعی اہمیت نہ رکھتی تھیں، اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ دین کے متعلق لوگوں کے تصورات غلط ہو رہے تھے اور بعض غیر جنس کی چیزوں کو دینی اہمیت حاصل ہو جانے کی وجہ سے فرقہ بندیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ امام غزالی نے ان خرابیوں کو دور کر کے ایک سمویا ہوا نظام بنایا جسکی ان کے ہم عصروں نے سخت

مخالفت کی مگر بالآخر تمام مسلم ممالک میں اس کے اصول تسلیم کر لیے گئے اور جتنے نئے نظامات تعلیم بنے وہ تمام تر انہی خطوط پر بنے جو امام نے کھینچ دیے تھے۔ اِس وقت تک مدارس عربیہ میں جو نصاب پڑھایا جارہا ہے اسکی ابتدائی خط کشی امام غزالی ہی کی رہینِ منت ہے۔

سابعاً، انہوں نے اخلاق عامہ کا پورا جائزہ لیا۔ انہیں علماء، مشائخ، امراء، سلاطین، عوام، سب کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خوب مواقع ملے تھے۔ خود چل پھر کر مشرقی دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھ چکے تھے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ انکی کتاب احیاء العلوم ہے جس میں انہوں نے ہر طبقہ کی اخلاقی حالت پر تنقید کی ہے، ایک ایک برائی کی جڑ اور اسکے نفسیاتی اور تمدنی اسباب کا کھوج لگایا ہے، اور اسلام کا صحیح اخلاقی معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ثامناً، انہوں نے اپنے عہد کے نظامِ حکومت پر بھی پوری آزادی کے ساتھ تنقید کی۔ براہ راست حکام وقت کو بھی پیہم اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے، اور عوام میں بھی یہ روح پھونکنے کی کوشش کی کہ منفعلانہ انداز سے جبر و ظلم کے آگے سر تسلیم خم نہ کریں بلکہ آزادانہ نکتہ چینی کریں۔ احیاء میں ایک جگہ صاف لکھتے ہیں کہ "ہمارے زمانہ میں سلاطین کے تمام یا اکثر اموال حرام ہیں"۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ "ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیے، نہ انکی دیکھنی چاہیے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ انکے ظلم سے بغض رکھے، انکے بقاء کو پسند نہ کرے، انکی تعریف نہ کرے، ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور انکے ہاں رسائی رکھنے والوں سے بھی دور رہے"۔ ایک اور جگہ اُن آدابِ پرستش و عبودیت پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں جو درباروں میں رائج تھے۔ اس معاشرت کی مذمت کرتے ہیں جو بادشاہوں اور امراء نے اختیار کر رکھی تھی۔ حتی کہ ان کے محلات، ان کے لباس، انکی آرائش، ہر چیز کو نجس بتلاتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے اپنے عہد کے بادشاہ کو ایک مفصل خط لکھا جس میں اس کو اسلامی طرزِ حکومت کی طرف دعوت دی، حکمرانی کی ذمہ داریاں سمجھائیں، اور اسے بتایا کہ تیرے ملک میں جو کچھ ظلم ہو رہا ہے خواہ

تو خود کرے یا تیرے عمال کریں، بہر حال اسکی ذمہ داری تجھ پر ہے۔ ایک دفعہ مجبوراً دربار شاہی میں جانا پڑا تو دوران گفتگو میں بادشاہ کے منہ در منہ کہا کہ:

"تیرے گھوڑوں کی گردن ساز زریں سے نہ ٹوٹی تو کیا ہوا، مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی"۔

اسی طرح ان کے آخری زمانہ میں جتنے وزراء سلطنت کے مدبّر امر ہوئے ان سب کو بھی امام نے پیہم خطوط لکھے اور رعایا کی تباہ حالی کی طرف توجہ دلائی۔ ایک وزیر کو لکھتے ہیں:

"ظلم حد سے گذر چکا ہے۔ چونکہ مجھے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا تھا اسلیے تقریباً ایک سال سے میں نے طوس کا قیام ترک کر دیا ہے تاکہ بے رحم و بے حیا ظالموں کی حرکات دیکھنے سے خلاصی پاؤں"۔

ابن خلدون کے بیان سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت کے قیام کے خواہاں تھے جو خالص اسلامی اصول پر ہو، خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو۔ چنانچہ مغرب اقصیٰ میں موحدین کی سلطنت انہی کے اشارہ سے انکے ایک شاگرد نے قائم کی۔ مگر امام موصوف کے کارنامے میں یہ سیاسی رنگ محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا۔ سیاسی انقلاب کے لیے انہوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھائی، نہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے۔ اسی لیے جاہلیت کی حکمرانی میں مسلمان قوموں کی حالت برابر خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک صدی بعد تاتاری طوفان کے دروازے ان پر ٹوٹ پڑے اور اس نے انکے پورے تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور رہنے کی وجہ سے اُن کے کام میں پیدا ہوئے۔ دوسری قسم اُن نقائص کی جو اُن کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے۔ اور تیسری قسم اُن نقائص کی

جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہو جانے کی وجہ سے تھے - ان کمزوریوں سے بچ کر امام موصوف کے اصل کام، یعنی اسلام کی ذہنی و اخلاقی روح کو زندہ کرنے اور بدعت و ضلالت کی آلائشوں کو نظامِ فکر و نظامِ تمدن سے چھانٹ چھانٹ کر نکال لینے کا کام جس شخص نے انجام دیا وہ ابنِ تیمیہ تھا۔

ابنِ تیمیہ

امام غزالی کے ڈیڑھ سو برس بعد ساتویں صدی کے نصف آخر میں امام ابنِ تیمیہ پیدا ہوئے۔[۱] یہ وہ زمانہ تھا کہ دریائے سندھ سے فرات کے کناروں تک تمام مسلمان قوموں کو تاتاری غارت گر پامال کر چکے تھے اور شام کی طرف بڑھ رہے تھے مسلسل پچاس برس کی ان شکستوں نے، دائمی خوف و بدامنی کی حالت نے اور علم و تہذیب کے تمام مرکزوں کی تباہی نے مسلمانوں کو اُس مرتبۂ پستی سے بھی بہت زیادہ نیچے گرا دیا تھا جس پر امام غزالی نے انہیں پایا تھا۔ نئے تاتاری حملہ آور اگرچہ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، مگر جاہلیت میں یہ حکمراں اپنے پیش روتر کی فرمانرواؤں سے بھی کئی قدم آگے تھے - ان کے زیر اثر آکر عوام اور علماء و مشائخ اور فقہاء و قضاۃ کے اخلاق اور بھی زیادہ گرنے لگے - تقلیدِ جامد اس حد کو پہنچ گئی کہ مختلف فقہی و کلامی مذاہب گویا مستقل دین بن گئے - اجتہاد معصیت بن کر رہ گیا - بدعات و خرافات نے شرعی حیثیت اختیار کر لی - کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ایسا گناہ ہو گیا جو کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا تھا - اس دور میں جاہل و گمراہ عوام، دنیا پرست یا تنگ نظر علماء اور جاہل و ظالم حکمرانوں کی ایسی سنگت بن گئی تھی کہ اس اتحادِ ثلاثہ کے خلاف کسی کا اصلاح کے لئے اٹھنا اپنی گردن کو قصاب کی چھری کے سامنے پیش کرنے سے کم نہ تھا - یہی وجہ ہے کہ گو اس وقت صحیح الخیال، وسیع النظر، حقیقت شناس علماء پابند نہ تھے، نہ اُن سچے اور اصلی صوفیوں کی کمی تھی جو جادۂ حق پر گامزن تھے، مگر جس نے اس تاریک زمانہ میں اصلاح کا علم اٹھانے کی جرأت کی وہ ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔

ابن تیمیہ حدیث کے امام تھے یہاں تک کہ کہا گیا کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیہ

[۱] پیدائش ۶۶۱ھ ۱۲۶۳ء - وفات ۷۲۸ھ ۱۳۲۷ء

فلیس بحدیث (جس حدیث کو ابنِ تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں ہے) ۔ تفقہ کی شان یہ تھی کہ بلاشبہ انکو مجتہد مطلق کا مرتبہ حاصل تھا۔ علوم عقلیہ، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی گہری نظر تھی کہ جن لوگوں کا سرمایۂ ناز یہی علوم تھے وہ اُنکے سامنے بچوں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اور اس پر جرأت وہمت کا یہ حال تھا کہ اظہارِ حق میں کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہ ڈرے، حتیٰ کہ متعدد مرتبہ جیل بھیجے گئے اور آخر کار جیل ہی میں جان دی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امام غزالی کے چھوڑے ہوئے کام کو ان سے زیادہ خوبی کے ساتھ آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے تجدیدی کارنامہ کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انہوں نے یونانی منطق وفلسفہ پر امام غزالی سے زیادہ گہری اور زبردست تنقید کی اور اس کی کمزوریوں کو اس طرح نمایاں کرکے رکھدیا کہ عقلیات کے میدان پر اس کا تسلط ہمیشہ کے لیے ڈھیلا ہو گیا۔ ان دونوں اماموں کی تنقید کے اثرات مشرق ہی تک محدود نہ رہے بلکہ مغرب تک بھی پہنچے ۔ چنانچہ یورپ میں ارسطو کی منطق اور مسیحی متکلمین کے یونان زدہ فلسفیانہ نظام کے خلاف پہلی تنقیدی آواز ابن تیمیہ کے ڈھائی سو برس بعد اٹھی ۔

(۲) انہوں نے اسلام کے عقائد، احکام، اور قوانین کی تائید میں ایسے زبردست دلائل قائم کیے جو امام غزالی کے دلائل سے زیادہ معقول بھی تھے اور اسلام کی اصلی روح کے حامل ہونے میں بھی ان سے بڑھے ہوئے تھے ۔ امام غزالی کے بیان واستدلال پر اصطلاحی معقولات کا اثر چھایا ہوا تھا۔ ابنِ تیمیہ نے اس راہ کو چھوڑ کر عقلِ عام (Commonsense) پر تفہیم وتبیین کی بنا رکھی جو زیادہ فطری، زیادہ مؤثر اور زیادہ قرآن وسنت کے قریب ہے۔ یہ نئی راہ پچھلوں کی راہ سے بالکل الگ تھی ۔ جو لوگ دین کے علمبردار تھے وہ فقط احکام نقل کر دیتے تھے، تفہیم نہ کر سکتے تھے ۔ اور جو کلام میں پھنس گئے تھے وہ تفلسف اور اصطلاحی معقولات کو ذریعۂ تفہیم بنانے کی وجہ سے کتاب وسنت کی اصلی اسپرٹ کو کم وبیش کھو دیتے تھے ۔ ابنِ تیمیہ نے عقائد واحکام کو انکی اصلی اسپرٹ کے ساتھ بے کم وکاست بیان بھی کیا اور

پھر تفہیم کا وہ سیدھا سادہ فطری ڈھنگ اختیار کیا جسکے سامنے اہلِ عقل کے لیے سر جھکا دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اسی زبردست کارنامے کی تعریف امام حدیث علامۂ ذہبی نے ان الفاظ میں کی ہے کہ ولقد نصر السنة المحضة والطريقة السلفية واحتج لها ببراهين ومقدمات وامور لم يسبق اليها۔ یعنی ابن تیمیہ نے خالص سنت اور طریقۂ سلف کی حمایت کی اور اسکی تائید میں ایسے دلائل اور ایسے طریقوں سے کام لیا جنکی طرف ان سے پہلے کسی کی نظر نہ گئی تھی۔

(۳) انہوں نے تقلید جامد کے خلاف صرف آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ قرون اولیٰ کے مجتہدین کے طریقہ پر اجتہاد کر کے دکھایا۔ براہ راست کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے استنباط کر کے، اور مختلف مذاہب فقہیہ کے درمیان آزادانہ محاکمہ کر کے، کثیر التعداد مسائل میں کلام کیا، جس سے راہ اجتہاد از سر نو باز ہوئی اور قوت اجتہادیہ کا طریق استعمال لوگوں پر واضح ہوا۔ اسکے ساتھ انہوں نے اور ان کے جلیل القدر شاگرد ابنِ قیم نے حکمت تشریع اور شارع کے طرزِ قانون سازی پر اتنا نفیس کام کیا جسکی کوئی مثال ان سے پہلے کے شرعی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ یہ وہ مواد ہے جس سے اسکے بعد اجتہادی کام کرنے والوں کو بہترین رہنمائی حاصل ہوئی اور آئندہ ہوتی رہیگی۔

(۴) انہوں نے بدعات اور مشرکانہ رسوم اور اعتقادی و اخلاقی گمراہیوں کے خلاف سخت جہاد کیا اور اس سلسلہ میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ اسلام کے چشمۂ صافی میں اُس وقت تک جتنی آمیزشیں ہوئی تھیں، اُس اللہ کے بندے نے ان میں سے ایک کو بھی نہ چھوڑا، ایک ایک کی خبر لی، اور ان سب سے چھانٹ کر ٹھیٹھ اسلام کے طریقہ کو الگ روشن کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اس تنقید و تنقیح میں اس شخص نے کسی کی رو رعایت نہ کی۔ بڑے بڑے آدمی، جنکے فضل و کمال کا اور تقدس کا سکہ مسلمانوں کی ساری دنیا پر بیٹھا ہوا تھا، جنکے نام سن کر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں، ابنِ تیمیہ کی تنقید سے نہ بچ سکے۔ وہ طریقے اور اعمال جو صدیوں سے مذہبی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھے، جنکے جواز، بلکہ استحباب کی دلیلیں نکال لی

گئی تھیں، اور علمائے حق بھی جن سے مداہنت کر رہے تھے، ابن تیمیہ نے انکو ٹھیٹھ اسلام کے منافی پایا اور انکی پرزور مخالفت کی۔ اس آزاد خیالی و صاف گوئی کی وجہ سے ایک دنیا انکی دشمن ہو گئی اور آج تک دشمن چلی آتی ہے۔ جو لوگ ان کے عہد میں تھے انہوں نے مقدمات قائم کر کے کئی بار جیل بھجوایا اور جو بعد میں آئے انہوں نے تکفیر و تضلیل کر کے اپنا دل ٹھنڈا کیا۔ مگر اسلام خالص و محض کے اتباع کا جو صور اس شخص نے پھونکا تھا اسکی بدولت ایک مستقل حرکت دنیا میں پیدا ہو گئی جسکی آواز بازگشت اب تک بلند ہو رہی ہے۔

اس تجدیدی کام کے ساتھ انہوں نے تاتاری وحشت و بربریت کے مقابلہ میں تلوار سے بھی جہاد کیا۔ اس وقت مصر و شام اس سیلاب سے بچے ہوئے تھے۔ امام نے وہاں کے عام مسلمانوں اور رئیسوں میں غیرت و حمیت کی آگ پھونکی اور انہیں مقابلہ پر آمادہ کیا۔ انکے ہم عصر شہادت دیتے ہیں کہ مسلمان تاتاریوں سے اتنے مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کا نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان کے مقابلہ میں جاتے ہوئے یوں ڈرتے تھے کانما یساقون الی الموت۔ مگر ابن تیمیہ نے ان میں جہاد کا جوش پھونک کر شجاعت کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کر دیا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آئیں۔

شیخ احمد سرہندی

ساتویں صدی میں فتنۂ تاتار نے ہندوکش سے اُس پار کی دنیا کو تو بالکل تاخت و تاراج کر دیا مگر ہندوستان اسکی دست بُرد سے بچ گیا تھا۔ اس ڈھیل نے یہاں کے مترفین کو اُسی غلط فہمی میں ڈال دیا جو ہمیشہ فریفتگانِ زینتِ دنیا کو لاحق ہوتی ہے۔ یہاں وہ تمام خرابیاں پرورش پاتی رہیں جو خراسان و عراق میں تھیں۔ وہی پادشاہوں کی خداوندی، وہی امرا و اہل دولت کی عیش پسندی، وہی باطل راستوں سے مال لینا اور باطل راستوں میں خرچ کرنا، وہی جبر و ظلم کی حکومت، وہی خدا سے

غفلت اور دین کی صراطِ مستقیم سے بُعد۔ رفتہ رفتہ نوبت اکبر بادشاہ کے دورِ حکومت تک پہنچی جس میں گمراہیاں اپنی حد کو پہنچ گئیں۔

اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملتِ اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، کسی مہذب وشائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں۔ نبوت، وحی، حشر ونشر، دوزخ وجنت، ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب وعذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ ہر آئینہ ممکن واقرب الی الصواب۔ معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذاتِ نبوی پر اعتراضات کیے جاتے، خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد پر اور آپ کے غزوات وسرایا پر۔ یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمد سے بھی بیزاری ہو گئی اور جنکے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا انکے نام بدلے جانے لگے دنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی۔ بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرنے لگے، العیاذ باللہ، العیاذ باللہ۔ دیوانِ خاص شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابو الفضل نے نماز، روزہ، حج اور دوسرے شعائرِ دینی پر سخت اعتراضات کیے اور ان کا مذاق اڑایا۔ شعراء نے ان شعائر کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک بھی پہنچی۔

بہائی نظریہ کی بنا بھی دراصل اکبری عہد ہی میں پڑی تھی۔ اُس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک ہزار سال گذر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی، اسلیے اب وہ منسوخ ہو گیا اور اسکی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکّوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا کیونکہ اس زمانہ میں نشر واشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اِسکے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی جسکا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے اس قسم کی پیشینگوئیاں

سنانی شروع کردیں کہ فلاں زمانہ میں ایک گنور کھشک مہاتما بادشاہ پیدا ہوگا۔ اور اسی طرح بندۂ زر علماء نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحب زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک "تاج العارفین" صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسان کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت سے خدا کا عکس ہی ٹھیرا دیا۔ عوام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا کہ "حق اور صدق (عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں، کوئی ایک ہی دین حق کا اجارہ دار نہیں ہے، لہٰذا سب مذہبوں میں جو جو باتیں حق ہیں انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیے اور اسکی طرف لوگوں کو دعوت عام دینی چاہیے تاکہ ملتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں، اسی طریق جامع کا نام دین الٰہی ہے۔" اس نئے دین کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے انکو "دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ ام" سے توبہ کر کے "دین الٰہی اکبر شاہی" میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ "چیلہ" سے تعبیر کیا جاتا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کر دیا گیا کہ سلام کرنے والا "اللہ اکبر" اور جواب دینے والا جل جلالہٗ کہتا (یاد رہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا)۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں سے ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا، اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اسکے سامنے سجدہ بجا لایا جاتا۔ علمائے کرام اور صوفیانِ باصفا، دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات و کعبۂ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور اس صریح شرک کو "سجدۂ تحیۃ" اور "زمین بوسی" جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جسکی پیشینگوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اسکو حلال کر لیا کرینگے۔

اس نئے دین کی بنا تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلا کسی تعصب کے ہر مذہب کی اچھی باتیں لی جائینگی، مگر دراصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پذیرائی تھی اور نفرت و عداوت کے لیے صرف اسلام

اور اسکے احکام و قوانین ہی کو مختص کر لیا گیا تھا۔ پارسیوں سے آتش پرستی لی گئی، اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنیکے وقت قیام تعظیمی کیا جانے لگا۔ عیسائیوں سے ناقوس نوازی اور تماشائے صورت ثالث ثلاثہ اور اسی قسم کی چند چیزیں لی گئیں۔ سب سے زیادہ نظرِ عنایت ہندوئیت پر تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثر آبادی کا مذہب تھا اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے اسکی استمالت ضروری تھی۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا۔ ہندو تہوار، دیوالی، دسہرہ، راکھی پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہَوَن کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا تو جلّت قدرتہٗ کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ دوش و کمر پر جنیوڑالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاد کے متعلق عقیدۂ تناسخ تسلیم کر لیا گیا اور برہمنوں سے انکے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے۔ یہ سارا معاملہ تو تھا دوسرے مذاہب کے ساتھ۔ رہا اسلام تو اسکے معاملہ میں بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ انکو اس سے ضد اور چڑ ہو گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر ذرا فلسفیانہ و صوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی اسے وحیِ آسمانی سمجھ کر قبول کر لیا جاتا اور اسکے مقابلہ میں اسلامی تعلیم ترک کر دی جاتی۔ علماء اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے، یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں "فقیہہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا جسکے معنی اُنکی اصطلاح خاص میں احمق اور ناقابلِ التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لیے مقرر کی گئی تھی جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری بلکہ عقیدتمندی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کا نام آتے ہی اُس کا مذاق اڑایا جانے لگتا تھا اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اسکی زبان بند کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا بلکہ عملاً اسلام کے احکام میں دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود، جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر

شراب کا استعمال ضروری تھا حتیٰ کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اسکے جواز پر دلائل قائم کیے گئے۔ چچازاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع ٹھیرایا گیا۔ لڑکے کے لیے ۱۶ سال اور لڑکی کے لیے ۱۴ سال کی عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ حدِ زنا نہ صرف موقوف کی گئی بلکہ چند ضوابط کے ساتھ زنا کو قانوناً جائز ٹھیرایا گیا۔ ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ختنہ کی ممانعت کردی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑیے کو حلال کیا گیا۔ سور کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا، حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اسکو دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مُردوں کو دفن کرنیکے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھیرایا گیا، اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلہ کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلہ ہی کی طرف پاؤں کرکے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کی مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کے درس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ ان علوم کو حاصل کرتے وہ حقیر خیال کیے جاتے۔ علوم دینی کے بجائے حکمت و فلسفہ، ریاضی و تاریخ اور اسی نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہلِ علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے۔

یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے اُنکی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا اسلیے وہ پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے۔ اِن دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا جس کا نام "اسلامی تمدن" تھا۔ اس میں شرک بھی تھا، نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے،

اوہام و خرافات بھی تھے، اور نو ایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔ دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوطہ سے موافقت کر لی تھی، بلکہ وہ اس نئے مت کے پروہت بنگئے تھے۔ لوگوں کی طرف سے اُنکو نذرانے پہنچتے، اور اُنکی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی۔ اشراقیت، رواقیت (Stoicism) اور ویدانتزم کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہوگیا تھا جسے اسلام کے نظام اعتقادی و اخلاقی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت و حقیقت، شرع اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا تھا اور اس کوچہ کا قانون یہ تھا کہ حدود حلال و حرام رخصت، احکام دین عملاً منسوخ، اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کلّی اختیارات، جس فرض کو چاہے ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے، جس حلال کو چاہے حرام کردے اور جس حرام کو چاہے حلال کردے۔ ان عام پیروں سے بہتر جنکی حالت تھی ان پر بھی کم و بیش اس فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے، اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بیکار کردیا تھا۔

یہ حالات تھے جب اکبری سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے[۱]۔ انکی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اُس دور کے صالح ترین لوگ تھے، گو اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے مگر کم از کم اپنے ایمان و عمل کو بچائے ہوئے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ صاحب سے پہنچا جو اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے۔ مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے کہ:

---

[۱] پیدائش ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء۔ وفات ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء۔

"حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اسکی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اِس دوران میں اُس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا اُسکی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دیگا۔"

یہ پیشینگوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اُس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ و تنہا احیاء دین کی جدوجہد کی۔ اس بے سروسامان فقیر نے علی الاعلان اُن گمراہیوں کی مخالفت کی جنہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی، اور اُس شریعت کی تائید کی جو حکومت کی نگاہ میں مبغوض تھی۔ حکومت نے اس کو ہر طرح دبانے کی کوشش کی حتی کہ جیل بھی بھیجا، مگر بالآخر وہ فتنہ کا منہ پھیر دینے میں کامیاب ہوگیا۔ جہانگیر، جس نے سجدۂ تحیۃ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں بھیج دیا تھا، آخر میں شیخ کا معتقد ہوگیا اور اپنے بیٹے خرم کو، جو بعد میں شاہجہان کے لقب سے تخت نشین ہوا، اُن کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے متعلق حکومت کی معاندانہ روش احترام سے بدل گئی۔ "دینِ الٰہی اکبر شاہی" اُن تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوا جو درباری شریعت سازوں نے گھڑی تھیں۔ اسلامی احکام کی جو ترمیم و تنسیخ کی گئی تھی وہ خود منسوخ ہوگئی۔ حکومت اگرچہ شاہی حکومت ہی رہی، مگر کم از کم اتنا ہوا کہ علوم دینی اور احکام شرعی کی طرف اُس کا رویہ کافرانہ ہونے کے بجائے عقیدت مندانہ ہوگیا۔ شیخ کی وفات کے تین چار ہی سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جنکی بدولت تیموری خاندان کے اُس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پرپوتا خادمِ شریعت ہوا۔

شیخ کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں

چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جواب سے تین چار سو برس پہلے ہی یہاں اسلام کا نام ونشان مٹا دیتا۔ اسکے علاوہ انہوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیے۔ ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو اُن آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راھبانہ گمراہیوں سے اُس میں سرایت کر گئی تھیں، پاک کر کے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ اُن تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اُس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور سلسلۂ بیعت و ارشاد کے ذریعہ سے اتباعِ شریعت کی ایک ایسی تحریک پھیلائی جسکے ہزارہا تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں میں، بلکہ وسط ایشیا تک پہنچ کر عوام کے اخلاق اور عقائد کی اصلاح کے لیے کوشش کی۔ یہی کام ہے جسکی وجہ سے شیخ سرہندی کا شمار مجددین ملت میں ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۴۰ سال بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوئے[۱]۔ ایک طرف اُنکے زمانہ اور ماحول کو اور دوسری طرف اُنکے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اِس نظر، اِن خیالات اِس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اِس تاریک زمانہ میں نشو و نما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظرِ عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے، تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے، اور ایسا لٹریچر چھوڑ کر جاتا ہے جسکی زبان، اندازِ بیان، خیالات، نظریات، مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، حتی کہ اسکے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اُس جگہ لکھی گئی تھیں جسکے گرد و پیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و

[۱] پیدائش ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء - وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء -

غارت، جبر و ظلم اور بدامنی و طوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔

شاہ صاحب تاریخ انسانی کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کرکے فکر و نظر کی ایک صاف، سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالاتِ موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی، اور تعمیر نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کرکے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریبِ فاسد و تعمیرِ صالح کے لیے ایک تحریک اٹھتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی عملی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لیے میدان میں نکل آتے ہوں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے لیڈروں کا اصلی کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تنقید سے صدہا برس کی جمی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں، ذہن میں نئی روشنی پیدا کرتے ہیں، زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے کو عالم ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے میں سے اصلی اور پائدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں۔ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیتوں سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آکر تعمیر کا عملی کام بھی کرسکے۔ اگرچہ شاہ صاحب تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں کہ اگر موقع و محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کرکے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت بھی رکھتا تھا[1]۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ انہوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے خیالات کی دنیا میں ان کا انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ خود اُن کے اپنے گھر اور اُن کے قریبی حلقہ

[1] تفہیمات جلد اول ص ۱۰۱ : فلو فرض ان یکون ھٰذا الرجل فی زمان واقتضت الاسباب ان یکون اصلاح الناس باقامۃ الحروب ونفث فی قلبہ اصلاحھم لقام ھٰذا الرجل بامر الحرب اتم قیام وکان اما مًا فی الحرب لا یقاس بالرستم والاسفندیار بل الرستم والاسفندیار وغیرھما طفیلیون علیہ مستمدون منہ مقتدون بہ۔

میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ انکی اصلاح پر بھی توجہ صرف کرنے سے معذور رہے ۔ مثلاً السلام علیکم تک کا رواج اُنکے گھر میں نہ تھا۔ "رفیع الدین آداب بجالاتا ہے" "عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے" سلام مسنون کے بجائے اس قسم کے فقرے بولے جاتے تھے ۔ شاہ صاحب کی پوتی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی جوان بیوہ بیٹھی ہوئی تھیں اور نکاح ثانی میں انہیں اسلیئے تامل تھا کہ ہندوانہ جاہلیت اِسے معیوب سمجھتی تھی ۔ بی بی کی صحنک اور اسی قسم کی نیاز نذر کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا۔[1] یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو تنقید و تعمیر افکار کے بھاری کام نے بالکل اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور انکو اس کارِ عظیم سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف ہی توجہ کر سکتے ۔ جیسا کہ آگے چل کر عرض کیا جائیگا ، اُن کے صاف کیے ہوئے راستہ پر عملی جدوجہد کرنے کے لیے کچھ دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی ، اور وہ نصف صدی کے اندر خود انہی کے حلقۂ تعلیم و تربیت سے نشو و نما پا کر اٹھے ۔

شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامے کو ہم دو بڑے عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں ۔ ایک عنوان تنقید و تنقیح کا ، اور دوسرا عنوان تعمیر کا ۔ میں ان دونوں کو الگ الگ بیان کرونگا ۔

---

[1] مولانا محمد منظور صاحب مدیر "الفرقان" نے مجھے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شاہ صاحب اور انکے خاندان کے متعلق یہ روایات کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں ۔ مجھے اِن کے صحیح ہونے پر اصرار نہیں ہے ۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بجائے خود حقیقت ہے ۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس پر شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوتِ عامہ کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع ہی نہیں ملا ۔ تطہیر و تعمیر فکر اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کام ہے ۔ اور دعوتِ عامہ کا کام اس سے مختلف ایک دوسری نوعیت کا کام ہے ۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دے سکے ۔ اور اگر کسی شخص نے صرف پہلا کام کیا ہو اور دوسرا کام نہ کر سکا ہو تو اس سے اسکی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔

کے نتائج کو بھی جس صراحت کے ساتھ انہوں نے پیش کیا ہے وہ اگلوں کے کلام میں مفقود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ارکان اسلام کی اقامت میں فتور عظیم برپا ہو گیا۔۔۔ حضرت عثمان کے بعد کسی فرمانروا نے حج قائم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے نائب ہی مقرر کر کے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامتِ حج خلافت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور شاہانِ گزشتہ کی شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لیے علامت پادشاہی تھا اسی طرح حج خود اپنی امارت میں قائم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے۔ خلیفہ کی اجازت کے بغیر نہ وعظ کہا جا سکتا تھا اور نہ کوئی شخص فتویٰ دینے کا مجاز تھا۔ مگر اس انقلاب کے بعد وعظ اور فتویٰ دونوں اس نگرانی سے آزاد ہو گئے بلکہ بعد میں تو فتویٰ دینے کے لیے جماعت صالحین کے مشورے کی قید بھی نہ رہی۔"

پھر فرماتے ہیں:

"ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں، معلوم نہیں آگے چل کر خدائے تعالیٰ کیا دکھانا چاہتا ہے۔"

رہی دوسری خرابی تو شاہ صاحب نے ازالہ میں، حجت میں، بدور بازغہ میں، تفہیمات میں، مسوّیٰ اور مصفّٰی میں، اور قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اس پر ماتم کیا ہے۔

ازالہ میں فرماتے ہیں:۔

"دولتِ شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا،

بلکہ سب اپنے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقہ پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے۔
دولتِ عراق (عباسی سلطنت) کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معین کیا اور یہ کیفیت
ہو گئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب و سنت کی دلیل پر حکم نہ کرتے
اس طرح وہ اختلافات جو ادلہ کتاب و سنت کے مقتضا سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے،
مضبوط بنیادوں پر جم گئے۔ پھر جب دولتِ عرب کا خاتمہ ہو گیا (یعنی ترکی اقتدار کا زمانہ
آیا) اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے
یاد کیا تھا اُسی کو اصل بنا لیا۔ پہلے جو چیز مذہبِ مستنبط تھی اب وہ سنت مستقرہ بن
گئی۔ اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں اور تفریع پر تفریع۔"
مصفّٰی میں لکھتے ہیں :-

"ہمارے زمانہ کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک
میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ اِن کا کاروبار ہی دوسرا ہے۔
یہ بیچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے لیے مکلّف ہی نہیں ہیں۔"

حجت کے مبحث ہفتم میں اور انصاف میں شاہ صاحب نے اس مرض کی پوری تاریخ بیان کی ہے
اور ان خرابیوں کی نشان دہی کی ہے جو اسکی بدولت پیدا ہوئیں۔

تاریخی تنقید کے بعد شاہ صاحب اپنے زمانہ کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک گروہ کو نام
بنام پکار کر اسکے نقائص بیان کرتے ہیں۔ تفہیمات میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"یہ وصی (یعنی خود شاہ صاحب) ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہے جبکہ لوگوں میں تین چیزیں
خلط ملط ہو گئی ہیں :

(۱) دلیل بازی اور یہ یونانی علوم کے اختلاط کی بدولت ہے۔ لوگ کلامی مباحث

میں مشغول ہو گئے ہیں یہاں تک کہ عقائد میں کوئی گفتگو ایسی نہیں ہوتی جو استدلالی مناظرات سے خالی ہو۔

(۲) وجدان پرستی، اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور انکی حلقہ بگوشی کی وجہ سے ہے جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے، یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں۔ ان کے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص ان رموز و اشارات کا انکار کرے یا ان سے خالی ہو وہ نہ مقبول ہوتا ہے، نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے۔ منبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جسکی تقریر اشارات صوفیہ سے پاک ہو، اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور غور و خوض کا اظہار نہ کرے، ورنہ اس کا شمار گمراہوں میں ہونے لگتا ہے۔ پھر امرا و رؤسا وغیرہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں جنکے ہاں لطف کلام اور بذلہ سنجی اور تفنن طبع کے لیے صوفیہ کے اشعار اور نکات کھلونا بنے ہوئے نہ ہوں۔

(۳) طاعت، اور یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ ملت اسلامیہ میں داخل ہیں۔

پھر اس زمانہ کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چلتا ہے اور بگ ٹٹ چلا جا رہا ہے، نہ متشابہات پر جا کر رکتا ہے اور نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا ہے جو اسکے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کلام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرہ و مباحثہ کر رہا ہے۔ دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی، شافعی وغیرہم کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر مذہب میں تخریجات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ

گیا ہے ''

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

'' میں ان پیرزادوں سے، جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں، کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے اور کیوں اُس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے، اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے آپ کو ھادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں ہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں یا اسلئے علم حاصل کرتے ہیں کہ اغراض دنیوی حاصل کریں، یا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفس کی اطاعت ان سے کراتے ہیں۔ یہ سب رہزن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں، خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں ....

میں اُن طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف و نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے، حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے، یا وہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو ...... تم پچھلے فقہاء کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اسکے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ یہ پیش کرتا ہے کہ ''صاحب احدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو

کاملین و ماہرین کا کام ہے، اور یہ حدیث ائمۂ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی، پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انہوں نے اسے ترک کر دیا۔ جان رکھو کہ یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف......

میں ان متقشف واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے بیٹھے۔ تم نے لوگوں کو موضوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا حالانکہ تم فراخی کے لیے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لیے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنا لیا ہے حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں، لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں.....

میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے۔ زناکاری، شراب خواری اور قمار بازی کے اڈے برسرِ عام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں مدتہائے دراز سے کوئی حدِّ شرعی نہیں لگائی گئی۔ جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو۔ کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا......

میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو تو اللہ نے جہاد کے لیے، اعلائے کلمۂ حق کے لیے، شرک و اہل شرک کا زور توڑنے کے لیے بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ

سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنالیا۔ اب جہاد کی نیت اور قصد سے تمہارے دل خالی ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے سپاہی گری کا پیشہ کرتے ہو۔ بھنگ اور شراب پیتے ہو۔ ڈاڑھیاں منڈاتے اور مونچھیں بڑھاتے ہو۔ بندگانِ خدا پر ظلم ڈھاتے ہو۔ اور تمہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کما رہے ہو یا حلال کی۔ خدا کی قسم تمہیں ایک روز دنیا سے جانا ہے، پھر اللہ تمہیں بتائیگا کہ کیا کرکے آئے ہو۔ ......

میں ان اہلِ حرفہ اور عوام سے کہتا ہوں کہ تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہو گئی ہے، اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو، اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ تم غیر اللہ کے لیے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو۔ یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو کوئی خوشحال ہو جاتا ہے وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اسکی آمدنی اسکے لیے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے، یا پھر وہ شراب نوشی اور کرایہ کی عورتوں میں اپنی معاش اور معاد دونوں کو ضائع کرتا ہے۔ ......

پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کرکے کہتا ہوں کہ اے بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیے، تم پر تنگ دلی چھاگئی اور شیطان تمہارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئی ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ حرام میں تمہیں مزا آتا ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزہ بن گیا ہے۔ ...... اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً روزِ عاشورا کو تم جمع ہو کر باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سب دن اللہ کے ہیں اور سارے حوادث اللہ کی مشیت سے ہوتے ہیں؟ اگر حسین

رضی اللہ عنہ اس روز شہید کیے گئے تو اور کونسا دن ہے جس میں کسی محبوبِ خدا کی موت واقع نہ ہوئی ہو؟ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے ۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے ۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے اس خیال اور ان حرکات کے لیے کوئی دلیل لاؤ ۔ پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے ، مثلاً شادیوں میں فضول خرچی ، طلاق کو ممنوع بنا لینا ، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا ۔ اس قسم کی رسموں میں تم اپنے مال اور اپنی زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایت صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے ، حالانکہ بہتر یہ تھا کہ ان رسموں کو چھوڑ کر اُس طریقہ پر چلتے جس میں سہولت تھی نہ کہ تنگی ۔ پھر تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے ، گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اُسکے اقربا خوب کھانے کھلائیں ۔ تم نمازوں سے غافل ہو ، کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے ۔ تم زکوٰۃ سے بھی غافل ہو ، تم میں کوئی مالدار ایسا نہیں جسکے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں ، وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور عبادت کی نیت نہیں کرتا ۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اسکے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو ۔ تم لوگ سخت بے تدبیر ہو گئے ہو ۔ تم نے اپنی بسر اوقات کا انحصار سلاطین کے وظائف و مناصب پر کر رکھا ہے اور جب تمہارا بار سنبھالنے کے لیے سلاطین کے خزانے کافی نہیں ہوتے تو وہ رعیت کو تنگ کرنے لگتے ہیں ...... "

ایک اور تفہیم میں فرماتے ہیں :-

"جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لیے اجمیر یا سالار مسعود کی قبر یا ایسے ہی دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس سے کم تر ہے آخر اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں فرق کیا ہے؟ جو لوگ لات اور عزیٰ سے حاجتیں طلب کرتے تھے اُن کا فعل اِن لوگوں کے فعل سے آخر کس طرح مختلف تھا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اُنکے برعکس اِن لوگوں کو صاف الفاظ میں کافر کہنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ خاص اِن کے معاملہ میں شارع کی نص موجود نہیں ہے۔ مگر اصولاً ہر وہ شخص جو کسی مُردے کو زندہ ٹھیرا کر اُس سے حاجتیں طلب کرتا ہے اُس کا دل گناہ میں مبتلا ہے"

یہ اقتباسات بہت طویل ہو گئے ہیں، اگر تفہیمات جلد دوم کے چند فقرے اور تقاضا کر رہے ہیں کہ ان کو بھی اس سلسلہ میں ناظرین تک پہنچا دیا جائے۔ فرماتے ہیں :-

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کرو گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے وہاں تم بھی قدم رکھو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اُنکے پیچھے جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ پہلی امتوں سے آپکی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنا لیا ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام

شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گناہگار میرے لیے۔ یہ اُسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (ہم دوزخ میں نہ جائینگے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لیے)۔ سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلۂ توحید میں۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انہیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہاء کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جنکے ماخذ کا پتہ ہی نہیں، مثلاً دہ دردہ کا مسئلہ[1] اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ[2]۔ رہے اصحاب معقول اور شعراء اور اصحابِ ثروت اور عوام تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے"۔

ان اقتباسات سے ایک دھندلا سا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے ماضی اور حال کا کس قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کس قدر جامعیت کے ساتھ اُن پر تنقید کی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جتنے صالح عناصر موجود ہوتے ہیں، جنکے ضمیر و ایمان میں زندگی اور جنکے قلب میں برے اور بھلے کی تمیز ہوتی ہے، ان کو حالات کی خرابی کا احساس سخت مضطرب کردیتا ہے۔ انکی اسلامی حس اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اپنے گردوپیش کی زندگی میں جاہلیت کا ہر اثر انہیں کھٹکنے لگتا ہے۔ انکی قوتِ امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو تحلیل کرنے لگتے ہیں۔ اور انکی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہوجاتی ہے کہ خارزار جاہلیت کی ہر کھٹک انہیں

[1] یعنی یہ مسئلہ کہ دس ہاتھ لمبا دس ہاتھ چوڑا حوض ہو تب اس کا پانی ماءِ کثیر ہوگا۔

[2] یعنی یہ مسئلہ کہ کنوئیں میں کس جانور کے گرنے پر کتنے ڈول پانی کے نکالے جائیں۔

اصلاح کے لیے بے چین کر دیتی ہے - اسکے بعد مجدد کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے، اُس پر وہ اپنی نظر جما سکیں اور اپنی تمام سعی و عمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں - یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب نے اُسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دیا جو اُنکے تنقیدی کام میں آپ دیکھ چکے ہیں -

تعمیر کے سلسلہ میں ان کا پہلا اہم کام یہ ہے کہ وہ فقہ میں ایک نہایت معتدل مسلک پیش کرتے ہیں جس میں کسی ایک مذہب کی جانب داری اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی - ایک محقق کی طرح انہوں نے تمام مذاہب فقہیہ کے اصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے - جس مذہب کی کسی مسئلہ میں تائید کی، اس بنا پر کی کہ دلیل اسکے حق میں پائی، نہ اس بنا پر کہ وہ اس مذہب کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں - اور جس سے اختلاف کیا، اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف پائی، نہ اس بنا پر کہ اُنہیں اُس سے عناد ہے - اسی وجہ سے کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں، کہیں شافعی، کہیں مالکی اور کہیں حنبلی - انہوں نے اُن لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مذہب کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کا اتباع کرینگے - اور اسی طرح وہ اُن سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنہوں نے ائمۂ مذاہب میں سے کسی کی مخالفت کا عہد کر لیا ہے - ان دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستہ پر چلتے ہیں جس میں ہر غیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے - ان کا رسالہ انصاف اس مسلک کا آئینہ ہے - یہی رنگ مصفّٰی اور انکی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے - تفہیمات میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

> "میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اسکی تفصیل یہ ہے کہ ابوحنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں - سب سے زیادہ پیرو بھی انہی دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں - فقہاء، محدثین، مفسرین

متکلمین اور صوفیہ زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں - اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے متبع ہیں - اس وقت جو امرِ حق ملاءِ اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے - دونوں کے مسائل کو حدیثِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے - جو کچھ ان کے موافق ہو وہ باقی رکھا جائے اور جسکی کوئی اصل نہ ملے اسے ساقط کر دیا جائے - پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر وہ دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انہیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے - اور اگر ان میں دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کیے جائیں اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے - یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلاف قرات کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی مخمصہ سے نکلنے کے دو راستوں کی سی نوعیت ہوگی جیسے تعدد کفارات، یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا - اِن چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاء اللہ تعالیٰ نہ پایا جائیگا۔"

انصاف میں انہوں نے اپنی رائے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ دی ہے چنانچہ باب ۴ میں واعلم ان التخریج علی کلام الفقہاء سے لیکر آخر باب تک جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اہل الحدیث اور اہلِ تخریج دونوں اسکو غور کی نگاہ سے دیکھیں - اس بحث میں انہوں نے جس طریقہ کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ طریق اہل حدیث اور طریق اہل تخریج، دونوں کو جمع کیا جائے - اسی طرح حجت کے مبحث ہفتم میں فصل ومما یناسب ھٰذا المقام التنبیہ علی مسائل ضلت فی بوادیھا الافہام کے تحت جو بحث کی ہے وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے - یہ مسلکِ معتدل اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلید جامد اور لاطائل

بحثوں میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے۔ چنانچہ اسکے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور قریب قریب انکی تمام کتابوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح تحقیق و اجتہاد پر اکسایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مصفیٰ کے مقدمہ سے چند فقرے انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

"اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است۔ و مراد از اجتہاد اینجا...... معرفت احکام شرعیہ از ادلہ تفصیلیہ و تفریع و ترتیب مجتہدانہ اگرچہ بارشاد صاحبِ مذہبے بودہ باشد۔ و آنکہ گفتیم اجتہاد در ہر عصر فرض است، بجہت آنست کہ مسائل کثیرۃ الوقوع غیر محصور اند، و معرفت احکام الٰہی در انہا واجب، و آنچہ مسطور و مدون شدہ است غیر کافی، و در انہا اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حلِ اختلافِ آں نتواں کرد، و طُرُقِ آں تا مجتہدین غالباً منقطع، پس بغیر عرض بر قواعدِ اجتہاد راست نیاید"۔

یہی نہیں کہ شاہ صاحب نے اجتہاد پر محض زور ہی دیا ہو، بلکہ انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتہاد کے اصول و قواعد اور اسکی شرائط کو بیان بھی کیا ہے۔ ازالہ، حجت، عقد الجید، انصاف، بدور بازغہ، مصفیٰ وغیرہ میں اس مسئلہ پر کہیں اشارات اور کہیں مفصل تقریریں موجود ہیں۔ نیز اپنی کتابوں میں جہاں بھی انہوں نے کسی مسئلہ پر گفتگو کی ہے ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے کی ہے، گویا اُن کی کتابوں کے مطالعہ سے آدمی کو نہ صرف اجتہاد کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اسکی تربیت بھی مل جاتی ہے۔

مذکورۂ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کیے ہیں، مگر جو کام ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیش روؤں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے ائمہ گذرے ہیں جنکے کام کو دیکھنے

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں، اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جنکے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔ انکی کتابوں میں سے حجۃ اللہ اور البدور البازغہ، دونوں کا موضوع یہی ہے پہلی کتاب زیادہ مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔

ان کتابوں میں انہوں نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفۂ اسلام کو مدون کرنے کی بنا ڈال رہا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان فلسفہ میں جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے اس کو محض نادانی سے لوگوں نے "فلسفۂ اسلام" کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفۂ اسلام نہیں، فلسفۂ مسلمین ہے جس کا شجرۂ نسب یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے۔ فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے اسکی داغ بیل سب سے پہلے اسی دہلوی شیخ نے ڈالی ہے۔ اگرچہ اصطلاحات وہی قدیم فلسفہ و کلام یا فلسفیانہ تصوف کی زبان سے لی ہیں، اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی وہیں سے آگئے ہیں، جیسا کہ اول اول ہر نئی راہ نکالنے والے کے لیے طبعاً ناگزیر ہے، مگر پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی یہ ایک بڑی زبردست کوشش ہے، خصوصاً ایسے شدید انحطاط کے دور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل حیرت انگیز ہے۔

اس فلسفہ میں شاہ صاحب کائنات کا اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا تصور قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے نظام اخلاق و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ و متحد المزاج ہوسکتا ہو، یا دوسرے الفاظ میں جس کو اگر شجرۂ اسلام کی جڑ قرار دیا جائے تو جڑ میں، اور اُس درخت میں جو اُس سے پھوٹتا،

عقلاً کوئی فطری مباینت محسوس نہ کی جا سکتی ہو ــــ میں حیران رہ جاتا ہوں جب سنتا ہوں کہ شاہ صاحب نے ویدانتی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا جوڑ لگا کر نئی ہندی قومیت کے لیے فکری اساس فراہم کرنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ مجھے ان کی کتابوں میں اس کوشش کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اور اگر مل جاتا تو باللہ العظیم کہ میں شاہ صاحب کو مجددین کی فہرست سے خارج کر کے متجددین کی صف میں لے جا کر بٹھاتا۔

مابعد الطبیعی بنیاد کو استوار کرنے کے بعد وہ اس پر ایک نظام اخلاق مرتب کرتے ہیں اور اس مقام پر انتہائی جذبۂ اعتراف کے ساتھ میں دیکھتا ہوں کہ وہ یونانی اتھکس کی غلامی سے پہلو بچا رہے ہیں، اُس اتھکس کی غلامی سے جس میں دوّانی جیسے لوگ جا پھنسے اور جس کا اچھا خاصا اثر امام غزالی تک کے ذہن پر قائم رہا۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب اس اتھکس کے اثر سے بالکل آزاد ہو چکے تھے۔

نظام اخلاق پر وہ ایک اجتماعی فلسفہ (Social philosophy) کی عمارت اٹھاتے ہیں جس کے لیے انہوں نے ارتفاقات کا عنوان تجویز کیا ہے، اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل، آداب معاشرت، سیاست مدن، عدالت، ضرب محاصل (Taxation)، انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں، اور ساتھ ہی اُن اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

پھر وہ نظام شریعت، عبادات، احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انہوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا، اور قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

---

[1] جو فلسفہ مسلمانوں میں رائج تھا وہ اسلام کے عملی، اخلاقی اور اعتقادی نظام سے کوئی ربط نہ رکھتا تھا، اس وجہ سے اس کا رواج جتنا جتنا بڑھا اسی قدر مسلمانوں کی زندگی بگڑتی چلی گئی، عقیدہ بھی کمزور ہوا، اخلاق بھی ڈھیلے ہوئے اور قوائے عمل بھی سرد ہو گئے۔ ذہن میں متصادم خیالات کی کشمکش کا یہ طبیعی نتیجہ ہے۔ اور یہی اثر اب موجودہ مغربی فلسفہ کے رواج سے بھی رونما ہو رہا ہے، کیونکہ وہ بھی کسی طرح نظام اسلامی کی فکری اساس نہیں بن سکتا۔

آخر میں انہوں نے تاریخ ملل و شرائع پر بھی نظر ڈالی ہے اور کم از کم میرے علم کی حد تک وہ پہلے شخص ہیں جس نے اسلام و جاہلیت کی تاریخی کشمکش کا ایک دھندلا سا تصور پیش کیا ہے۔

نظام اسلامی کے اس قدر معقول اور اتنے مرتب خاکے کا پیش ہو جانا بجائے خود اس امر کی پوری ضمانت ہے کہ وہ تمام صحیح الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کا نصب العین بن جائے، اور جو لوگ اُن میں سے زیادہ قوتِ عمل رکھتے ہوں وہ اس نصب العین کے لیے جان و تن کی بازی لگا دیں، خواہ اس نصب العین کو سامنے رکھنے والا خود عملاً ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرے یا نہ کرے۔ مگر جو چیز اس سے بھی زیادہ محرک ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ شاہ صاحب نے جاہلی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیا، اور نہ صرف اسلامی حکومت کی خصوصیات صاف صاف بیان کیں، بلکہ اس بحث کو بتکرار ایسے طریقوں سے پیش کیا جن کی وجہ سے اصحاب ایمان کے لیے جاہلی حکومت کو اسلامی حکومت سے بدلنے کی جدوجہد کیے بغیر چین سے بیٹھنا محال ہو گیا۔ یہ مضمون حجت میں بھی کافی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، مگر ازالۃ تو گویا ہے ہی اسی موضوع پر۔ اس کتاب میں وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں کہ خلافت اسلامی اور بادشاہی، دو بالکل مختلف الاصل چیزیں ہیں۔ پھر ایک طرف بادشاہی کو اور ان تمام فتنوں کو رکھتے ہیں جو بادشاہی کے ساتھ مسلمانوں کی حیات اجتماعی میں از روئے تاریخ پیدا ہوئے، اور دوسری طرف خلافت اسلامی کی خصوصیات اور شرائط کو اور اُن رحمتوں کو پیش کر دیتے ہیں جو اسلامی خلافت میں فی الواقع مسلمانوں پر نازل ہو چکی ہیں۔ اسکے بعد کس طرح ممکن تھا کہ لوگ چین سے بیٹھ جاتے۔

سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید

یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات[1] اور شاہ شہیدؒ کی منصب امامت عبقات

[1] سید صاحب ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء (۸۷) میں شہادت پائی۔ شاہ اسماعیل صاحب ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ انقلابی تحریک کی چنگاری سید صاحب کے دل میں غالباً ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ زمانے ہی میں بھڑک اٹھی تھی۔

تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئیگی۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کردی، اور پھر ان کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جنکے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے، جنکے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی، اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور انکے حلقہ کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اس چیز نے اُس تحریک کے لیے گویا زمین تیار کردی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقہ سے، بلکہ یوں کہیے کہ انکے گھر سے اٹھنے والی تھی۔

سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں، اور اس وجودِ متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انہوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔

(۲) انہوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سرِ تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبّر کے ساتھ آغاز کار کے لیے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہو سکتا تھا۔

پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اس طرح انہوں نے صحیح معنوں میں روح اسلامی کا پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے مظاہرہ کر دیا۔ ان کی جنگ ملک و مال یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ انکے سامنے کوئی مقصد اسکے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت کر کے تلوار اٹھائی۔ اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔ انکی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ انکی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈا بنتی تھی، اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ انکی فوج کسی علاقے سے گذری ہو اور اس علاقے کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں۔ انکے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے، اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے خواہ اُس پر قائم رہنے میں انکو فائدہ پہنچے یا نقصان۔ انہوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے، اور کہیں فتح پائی تو جبّار اور متکبر نہ پائے گئے۔

(۳) اُن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اُس میں انہوں نے ٹھیک اُس طرز کی حکومت قائم کی جسکو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل و انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور

اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انہوں نے اسی حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیق و فاروق نے کی تھی۔

یہ لوگ بعض طبعی اسباب کی وجہ سے، جنکا ذکر آگے آتا ہے، ناکام ہوئے، مگر خیالات میں جو حرکت وہ پیدا کر گئے تھے اسکے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں۔

اسبابِ ناکامی اس آخری مجددانہ تحریک کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنا عموماً اُن حضرات کے مذاق کے خلاف ہے جو بزرگوں کا ذکر عقیدت ہی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسلیے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں اس عنوان کے تحت عرض کرونگا وہ میرے بہت سے بھائیوں کے لیے تکلیف کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا مقصد اس تمام ذکر اذکار سے محض سابقین بالایمان کو خراجِ تحسین ہی پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ آئندہ تجدید دین کے لیے ان کے کاموں سے سبق حاصل کرنا بھی ہے، تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور ان بزرگوں کے کارناموں کا سراغ لگانے کے ساتھ اُن اسباب کا کھوج بھی لگائیں جنکی وجہ سے یہ اپنے مقصد کو پہنچنے میں ناکام ہوئے۔ شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادوں نے علماء حق اور صالحین کی جو عظیم القدر جماعت پیدا کی، اور پھر سید صاحب اور شاہ شہید نے صلحاء و اتقیاء کا جو لشکر فراہم کیا، اُسکے حالات پڑھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرنِ اول کے صحابہ و تابعین کی سیرتیں پڑھ رہے ہیں، اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم سے اس قدر قریب زمانہ میں اس پایہ کے لوگ ہو گذرے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمارے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی زبردست اصلاحی و انقلابی تحریک، جسکے لیڈر اور کارکن ایسے صالح و متقی اور ایسے سرگرم مجاہد لوگ تھے، انتہائی ممکن سعی و عمل کے باوجود ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، اور اسکے برعکس کئی ہزار میل سے آئے ہوئے انگریز یہاں خالص جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس سوال کو عقیدتمندی کے جوش میں لاجواب چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ صلاح و تقویٰ اور جہاد کو اس دنیا

کی اصلاح کے معاملہ میں ضعیف الاثر سمجھنے لگیں اور یہ خیال کر کے مایوس ہو جائیں کہ جب ایسے زبردست متقیانہ جہاد سے بھی کچھ نہ بنا تو آئندہ کیا بن سکیگا۔ میں اس قسم کے شبہات فی الواقع لوگوں کی زبان سے سن چکا ہوں، بلکہ حال میں جب مجھے علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اسٹریچی ہال کے بھرے جلسہ میں میرے سامنے یہی شبہ پیش کیا گیا تھا اور اسے رفع کرنے کے لیے مجھے ایک مختصر تقریر کرنی پڑی تھی۔ نیز مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت علماء صالحین کی جو جماعت ہمارے درمیان موجود ہے وہ بالعموم اس مسئلہ میں بالکل خالی الذہن ہے، حالانکہ اگر اس کی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے سبق ہمیں مل سکتے ہیں جن سے استفادہ کر کے آئندہ زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح کام ہو سکتا ہے۔

پہلا سبب | پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور انکے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے، اور اسکی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال، اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اِس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے۔ اسکے سوا اس کے لیے دوسرا قالب بھی ممکن ہے۔ اسکے لیے زبان بھی دوسری اختیار کی جاسکتی ہے، رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جاسکتا ہے، اور پیری مریدی اور اس سلسلہ کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ اسی قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے، حالانکہ یہ پرانا قالب اس بنا پر قابلِ ترک تھا اور ہے کہ مدتہائے دراز سے اسی قالب میں جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہو رہی ہے اور اس کی کثرتِ اشاعت سے مسلمانوں کو سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے، اور اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک

شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، مگر یہ قالب جہاں استعمال کیا گیا اور پھر وہی تمام بیماریاں عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اسکے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جبکہ مریض کے لیے نقصان دہ ہو، اُسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اِسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہیں جو صدیوں ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی وہی "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید" والی ذہنیت جسکے بعد پیر صاحب اور اربابٌ من دون اللہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوتِ تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگیٔ شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اسکے مربوب۔ پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی اور معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو گئے۔ اسکے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بیچارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہے۔ مسلمانوں کے اِس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالباً اِس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متأثر ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی تھی جو ابنِ تیمیہ کی تھی لیکن شاہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل

رہا تھا، اسلیے مرضِ صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی، حتیٰ کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی ایک گروہ انکے حلقہ میں ایسا پیدا ہو گیا جو شیعوں کی طرح انکی غیبوبت کا قائل ہوا اور اب تک اُن کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے۔ اب جس کسی کو تجدیدِ دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو اُسکے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات رموز و اشارات، لباس، اطوار، پیری مریدی اور ہر اُس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسرا سبب دوسری چیز جو مجھے تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ سید صاحب اور شاہ شہید نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اُس علاقہ کو اِس انقلاب کے لیے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ اُن کا لشکر تو یقیناً بہترین اخلاقی و روحانی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا، مگر یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے تھے اور شمالی مغربی ہندوستان میں انکی حیثیت مہاجرین کی سی تھی۔ اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا، تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے اور اُسکے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں، اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اسلیے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کرینگے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا، اور جتنا ملک قابو میں آیا اُس پر اسلامی خلافت قائم کر دی۔ لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور ان سے وہ توقعات وابستہ کرنا جو اصلی مسلمان ہی پوری کر سکتے ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا تو خود بھی گرے اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے۔ تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ ہر تجدیدی تحریک میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں

وہ نقش برآب کی طرح ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا، اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔

تیسرا سبب | اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تجدیدی تحریک کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آئے ہوئے انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پا سکتے جب تک کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو۔ شاہ صاحب اور انکے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لیے جو کام کیا، اُسکی طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیے اور دوسرے پلڑے میں اُس طاقت کو رکھیے جسکے ساتھ انکی ہم عصر جاہلیت اٹھی تھی، تب آپکو پورا اندازہ ہوگا کہ اس عالم اسباب میں جو قوانین کارفرما ہیں اُن کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا۔ میں مبالغہ نہ کرونگا اگر یہ کہوں کہ ان دونوں قوتوں میں ایک تولے اور پچاس من کی نسبت تھی اسلیے نتیجہ جو فی الواقع رونما ہوا اُسکے سوا اور کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے، اسی دور میں یورپ قرونِ وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں ہر علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ وہی دور تھا جس میں ہیوم، کانٹ، فشٹے (Fichte)، ہیگل، کونت (Comte)، شلائیرماشر (Schliermacher) اور مِل جیسے فلاسفہ پیدا ہوئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبیعات میں گیلوینی (Galvani) اور وولٹا (Volta)، علم الکیمیا میں لاووزیرے (Lavoisier) پریسٹلے (Priestlay)، ڈیوی (Davy)، ہاٰیوی (Haüy)، اور برزِلیس (Berzelius)، احیاتیات میں لینے (Linne)، ہالر (Haller)، بیشات (Bichat) اور

وولف (Wolff) جیسے محققین اٹھے جنکی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ اسی دور میں کویسنے (Quesnay)، ٹرگوٹ (Turgot)، آدم سمتھ اور مالتھس کی دماغی کاوشوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو، والٹیر، مونٹسکیو، ڈینس ڈائڈیرو (Denis Diderot)، لامیٹری (La Mettrie)، کیبانیس (Cabanis)، بفون (Buffon)، روبینٹ (Robinat)، انگلستان میں ٹامس پین (Paine)، ولیم گوڈون (Godwin)، ڈیوڈ ہارٹلے، جوزف پریسٹلے، ارسمس ڈارون، اور جرمنی میں گوئٹے، ہرڈر، شیلر، ونکلمان (Winckelmann)، لسنگ (Lessing)، اور بیرن دی ہولباش (Baron d'Holbach) جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمران پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کرکے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔ پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی ندرت، اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے اِن لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیے، نظام تعلیم بدل دیا، نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا، اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل ڈالا۔ اسی زمانہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائلِ زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں انجینیرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فنِ جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے

میدان جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھیرنا مشکل ہوگیا۔ فوجوں کی ترتیب، عساکر کی تقسیم اور جنگی چالوں میں بھی بہم تغیرات ہوئے، اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں۔ رائفل ایجاد ہوئی، ہلکی اور سریع الحرکت میدانی توپیں بنائی گئیں، قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں، اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلہ میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بیکار کر کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلہ میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں، اور نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کر لیا۔

معاصر تاریخ کے اس سرسری خاکے پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند خاص اشخاص ہی بیدار ہوئے تھے مگر وہاں قوموں کی قومیں جاگ پڑیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا تھا، اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا جس میں تیز رفتار پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں، اور وہاں لائبریریاں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہو گئیں۔ یہاں فلسفہ، اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرح نو کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک رہی جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا، اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہو گئے جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علوم طبیعیہ اور قوائے مادیہ کا علم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا، اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے مقابلہ میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعی محال تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر انہوں نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں تو دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر اُنکے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسبابِ طاقت کیا ہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے۔ انہوں نے سارے انتظامات تو کیے مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جا رہی ہے، اور نئے آلات نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے، اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے، اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے، اور اسکے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لیے اٹھے ہیں، اُس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریز کی ہے، اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالف طاقت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دور رس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے جس حریف سے نمٹنا ہوگا اُسکے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کریں، اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کریں۔ بہرحال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو اس عالمِ اسباب میں ایسی چُوک کے نتائج سے وہ نہ بچ سکتے تھے۔

مغربی جاہلیت کے مقابلہ میں اسلامی تجدید کی اس تحریک کو جو ناکامی ہوئی اُس سے پہلا سبق تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ تجدید دین کے لیے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام

فنون و صناعات اور تمام شعبہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے۔ اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب الماخذ ہے، یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جاہلیتِ جدیدہ بے شمار نئے وسائل کے ساتھ آئی ہے اور اس نے بے حساب نئے مسائلِ زندگی پیدا کر دیے ہیں جنکا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے قدماء کے ذہن میں نہ گذرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہٗ کے علم اور اسکی بخشش سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن تھے، لہذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لیے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور اس رہنمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہِ عمل تعمیر کرنے کے لیے ایسی مستقل قوتِ اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو، اگرچہ استفادہ وہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔

نیا نظامِ تعلیم

[یہ وہ خطبہ ہے جو ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی انجمن اتحاد طلبہ کے سامنے مدیر "ترجمان القرآن" نے عرض کیا]

حضرات! خوش قسمتی سے آج مجھے اُس جگہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے جہاں موجودہ دور میں سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح کا تخیل پیدا ہوا، اور سب سے پہلا قدم اسکی طرف اٹھایا گیا۔ اسی وجہ سے میں نے اس موقع کے لیے تعلیمی اصلاح ہی کے سوال کو اپنا موضوع بحث منتخب کیا ہے۔ میرے اس انتخاب میں ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ اِس وقت ہماری دینی درس گاہوں میں عموماً اصلاح تعلیم کے مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو گیا ہے، مگر جس انداز سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اصلاح کی خواہش کرنے والوں کے ذہن میں مسئلہ کی نوعیت کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض ضروری علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ اسلیے اصلاح کی ساری بحث صرف اس حد تک محدود رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے کچھ دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے، عناصر تعلیمی کے تناسب میں ترمیم کر کے بعض اجزاء گھٹائے اور بعض بڑھائے جائیں، اور قدیم علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی بھی کچھ کتابیں طلبہ کو پڑھائی جائیں۔ ایسی ہی کچھ جزوی ترمیمات طرز تعلیم اور انتظام مدارس میں بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ اور بہت زیادہ "روشن خیالی"

پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے۔ لیکن یہ جدت جو آج دکھائی جا رہی ہے، یہ اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اسکی عمر اتنی ہے جتنی آپکے دار العلوم ندوۃ العلماء کی عمر ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس قسم اصلاح کا یہ نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آجائیں، اور وہ دنیا جو آج آگ کی طرف چلانے والے ائمہ (Leaders) کے پیچھے چل رہی ہے، جنت کی طرف بلانے والے ائمہ کی رہبری قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ نتیجہ اگر حاصل کرنا مقصود ہو تو آپ کو مکمل انقلابی اصلاحات کے لیے تیار ہونا پڑیگا اور اس سارے نظام تعلیم کو ادھیڑ کر از سر نو ایک دوسرا ہی نظام تعلیم بنانا ہوگا۔ اس صحبت میں اسی نئے نظام تعلیم کا نقشہ میں آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

علم اور امامت کا رشتہ سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اس دنیا میں امامت و قیادت Leadership کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنا پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اسکے پیچھے چلتی ہے، کبھی بابل امام بنتا ہے اور دنیا اسکی پیروی کرتی ہے، کبھی یونان امام بنتا ہے اور دنیا اس کا اتباع کرتی ہے، کبھی اسلام قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں اور دنیا انکے نقش قدم پر ہو لیتی ہے، اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور دنیا اسکی تبع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جسکی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے، کل اس سے چھن کر دوسرے کی طرف چلی جاتی ہے، اور پرسوں اس سے بھی سلب ہو کر تیسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے؟ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ اتفاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصل مقرر بھی ہے؟ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ ہاں اس کا ضابطہ ہے، اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہیگا۔ انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اس کو سمع، بصر، اور فؤاد، تین چیزیں ایسی دی گئیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اسکی بہ نسبت کم تر

دی گئی ہیں - اسلیے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے - اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائیگا وہ اُسی طرح ان سب کا امام بننے کا اہل ہوگا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے -

تقسیم امامت کا ضابطہ اس جواب سے خود بخود دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ علم سے مراد کیا ہے؟ اور اُس میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کا حل سمع، بصر، اور فؤاد ہی کے الفاظ میں پوشیدہ ہے - کلام الٰہی میں یہ تینوں لفظ مجرد سننے، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں، بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کی ہوئی معلومات حاصل کرنا ہے، بصر سے مراد خود مشاہدہ کرکے واقفیت بہم پہنچانا ہے، اور فؤاد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کو مرتب کرنا اور نتائج اخذ کرنا ہے - یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جسکی قابلیت انسان کو دی گئی ہے - بر سبیل اطلاق اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخلوقات ارضی پر خلیفانہ تسلط ہر انسان کو حاصل ہے - ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھیے گا تو معلوم ہوگا کہ جو انسان انفرادی طور پر، اور جو انسانی گروہ اجتماعی طور پر ان تینوں قوتوں سے کم کام لیتے ہیں وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں، انہیں تابع اور مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے ان کا کام پیچھے ہی چلنا ہوتا ہے - بخلاف اسکے جو ان تینوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و غالب ہوتے ہیں، متبوع اور مطاع بنتے ہیں، رہنمائی و پیشوائی انہی کے حصہ میں آتی ہے - مگر امامت ملنے اور چھننے کا ضابطہ معلوم کرنے کے لیے آپکو اس سے بھی زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالنی ہوگی - اس تفصیلی نگاہ میں آپکو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ایک گروہ تمام انسانوں کا امام اُس وقت بنتا ہے جب وہ ایک طرف اُن معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرتا ہے جو ماضی اور حال کے انسانوں سے حاصل ہوسکتی ہیں، اور دوسری

طرف خود اپنے مشاہدہ سے مزید معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا ہے، تیسری طرف اِن دونوں قسم کی معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کرتا ہے اور پھر اُن نتائج سے کام لیتا ہے، پہلے کی جو چیزیں غلط ـــ کم از کم اسکے اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے غلط ـــ ثابت ہوتی ہیں انکی اصلاح کرتا ہے، پہلے کی جن چیزوں کا نقص ـــ کم از کم اس کے فہم کے لحاظ سے ـــ اس پر کھلتا ہے اُنکی تکمیل کرتا ہے، اور جو نئی چیزیں علم میں آتی ہیں ان سے اپنی حدِ وسع تک زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صفات جب تک اُس گروہ میں تمام دوسرے انسانی گروہوں سے زیادہ رہتی ہیں، وہی پوری نوع کا امام ہوتا ہے اور جو ان صفات کے اعتبار سے کمتر ہوتے ہیں اُن کے لیے اللہ کی امت تقدیر یہ ہے کہ وہ اسکی اطاعت بھی کریں اور اتباع بھی ـــ اگر قسمت کی یاوری نے اطاعت سے بچا بھی لیا تو انکے لیے اتباع سے تو کوئی مفر نہیں ہوتا، خواہ جان بوجھ کر بالارادہ کریں، خواہ بے جانے بوجھے اضطراراً کریں۔

اس دورِ عروج کے بعد جب اس گروہ کے زوال کا وقت آتا ہے تو وہ تھک کر اور اپنے کیے ہوئے کام کو کافی سمجھ کر مشاہدہ سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فوائدِ سمع سے مزید نتائج اخذ کرنے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے، اور اس کا تمام سرمایۂ علمی صرف سمع سے حاصل شدہ معلومات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اسکے لیے علم کے معنی صرف یہ جاننے کے ہو جاتے ہیں کہ پہلے جو معلومات حاصل کی گئی تھیں اور ان سے جو نتائج اخذ کیے گئے تھے وہ کیا تھے۔ اب وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے وہ کافی ہے، اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں، پہلے جو نتائج اخذ کیے جا چکے ہیں وہ صحیح ہیں، ان میں کسی اصلاح و ترقی کا موقع نہیں، پہلے جتنی تعمیر ہو چکی ہے وہ مکمل ہے، نہ اس میں ترمیم ہی کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے آگے مزید تعمیر ہی ممکن ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ گروہ خود امامت سے ہٹ جاتا ہے اور نہ ہٹنا چاہے تو زبردستی ہٹا دیا جاتا ہے۔ پھر جو دوسرا گروہ مزید اکتسابِ علم، مزید اخذِ نتائج، اور مزید تعمیرِ حیات کا عزم لیکر آگے بڑھتا ہے امامت و قیادت اس کا حصہ ہوتی ہے، اور وہ صاحب جو پہلے امام تھے اب مقتدی بنتے

ہیں، جو پہلے مطاع و متبوع تھے، اب مطیع و تابع بنتے ہیں، جو پہلے جیتے جاگتے علم کے مالک اور دنیا کے استاد بنے ہوئے تھے، اب عجائب خانۂ آثار قدیمہ میں بھیج دیے جاتے ہیں تاکہ بیٹھے علوم اوائل کی تشریح کرتے رہیں۔

موجودہ "اسلامی نظام تعلیم" کا بنیادی نقص اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامت، خواہ وہ آگ کی طرف لیجانے والی ہو یا جنت کی طرف، بہرحال اُس گروہ کا حصہ ہے جو سمع و بصر و فؤاد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا اٹل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رورعایت نہیں ہے۔ کوئی گروہ خواہ خدا شناس ہو یا ناخدا شناس، بہرحال وہ یہ شرط پوری کریگا تو دنیا کا امام بن جائیگا اور نہ کریگا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں مطیع بھی بننے سے نہ بچ سکیگا۔

آپکو جس چیز نے امامت کے منصب سے ہٹایا اور ناخدا شناس اہلِ مغرب کو اس پر لا بٹھایا وہ دراصل یہی ضابطہ ہے۔ آپکے ہاں مدتہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اُس میں بصر اور فؤاد دونوں معطل تھے، اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اسکے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور اس نے سمع سے بھی آپ سے بڑھ کر کام لیا اور بصر و فؤاد کا کام تو پچھلی ڈھائی تین صدیوں میں تمام تر اسی نے انجام دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور یہی ہوا کہ وہ امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپکی دینی تعلیم کے تمام مرکز ابھی تک اپنی اُسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپکو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان کے ہاں علم محض علوم اوائل کے پڑھنے پڑھانے تک محدود ہے۔ ندوہ اور ازہر نے اصلاح کی طرف ایک قدم بڑھایا، مگر اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جائے۔ بصر اور فؤاد پھر بھی معطل کے معطل ہی رہے۔ اِس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت بہرحال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجویزیں میری نظر سے گذری ہیں وہ سب کی سب بہتر

مقتدی ہی بنانے والی ہیں۔ امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک نہیں سوجھی گئی حالانکہ دنیا کی واحد خدا شناس جماعت ہونے کی حیثیت سے جو فرض آپ کے ذمہ عائد ہوتا ہے اسکو آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ آپ ناخداشناس لوگوں سے دنیا کی امامت کا منصب چھین کر خود اس پر قبضہ نہ کریں۔ اور اسکی کوئی صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ آپ مجرد سمعی علم پر قناعت کا خیال چھوڑیں اور بصیر و فواد سے نہ صرف کام لیں بلکہ اس میں دنیا کے تمام گروہوں پر فوق لے جائیں۔

کس قسم کی اصلاح درکار ہے | یہ جو میں نے عرض کیا کہ "دنیا کی واحد شناس جماعت ہونے کی حیثیت سے آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اسکو آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک یہ کام نہ کریں" یہ دراصل میری اس تمام بحث کا مرکزی نکتہ ہے اسلیے میں اسکی مزید تشریح کرونگا۔ اگر محض ایک انسانی گروہ ہونے کی حیثیت سے مطلقاً امام بننے کا سوال ہو تب تو آپکو کسی اصلاح تعلیم یا تجدید نظام تعلیمی کی ضرورت نہیں۔ سید صاحب ارشاد کھلا ہوا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی، یا مصر و ایران و ٹرکی کی سرکاری یونیورسٹیوں کے طرز پر تعلیم کے میدان میں پیش قدمی فرمائیے اور اُسی قسم کی امامت کے لیے امیدوار بن جائیے جیسی اس وقت یورپ اور امریکہ کو حاصل ہے اور جسکے لیے اب جاپان مسابقت کر رہا ہے۔ مگر خداشناس گروہ ہونے کی حیثیت سے آپکی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ آپکی یہ پوزیشن ہرگز نہیں ہے کہ آپ محض اپنے لیے امامت چاہتے ہوں خواہ وہ امامت داعیہ الی النار ہو یا داعیہ الی الجنت۔ یورپ سے آپکا جھگڑا اس بنا پر نہیں ہے کہ دنیا کا امام وہ نہ رہے، اسکی جگہ آپ ہو جائیں۔ بلکہ اس سے آپکا جھگڑا اصول اور مقصد کا جھگڑا ہے۔ وہ ناخداشناسی بلکہ خدا سے بغاوت اور طغیان کی بنا پر دنیا کی امامت کر رہا ہے اور آگ کی طرف ساری دنیا کو لیجا رہا ہے۔ بخلاف اسکے آپ خداشناس گروہ انسانی ہیں۔ خدا کی اطاعت پر آپکے مسلک کی بنیاد ہے۔ آپکے ایمان کی رو سے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ نہ صرف خود آگ کے راستہ سے بچ کر جنت کے راستہ پر جائیں بلکہ دنیا کو بھی اسی راستہ پر چلائیں۔ اور یہ فرض آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ آپ اُس سے

امامت چھین کر خود امام نہ بنیں۔ یہاں سوال نسلی یا جغرافی نہیں، خالص اصولی ہے۔ ناخداشناسی کی امامت اگر ترک، یا ایرانی یا مصری یا ہندوستانی کی ہو تو وہ بھی اسی طرح مٹادینے کے قابل ہے جس طرح فرنگی یا جاپانی کی۔ اور خداشناسی کی بنیاد پر جو امامت ہو وہی مطلوب ہے، خواہ اسکے علمبردار ہندی ہوں یا فرنگی یا کوئی اور۔

ناخداشناس امامت کے نتائج کسی امام کے داعی الی النار یا داعی الی الجنۃ ہونے کا مدار بالکل اسکے خداشناس یا ناخداشناس ہونے پر ہے۔ جب کوئی ایسا گروہ جو خداشناس نہ ہو اپنے علمی اجتہاد کی بدولت دنیا کا امام بن جاتا ہے، تو وہ تمام سمعی و بصری معلومات کو اس نقطۂ نظر سے جمع کرتا ہے اور اسی نقطۂ نظر کے مطابق مرتب کرتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے، انسان محض ایک غیر مسئول (Irresponsible) ہستی ہے۔ دنیا کی جو چیزیں اُسکے لیے مسخر ہیں وہ سب اُسکی مِلک ہیں جن سے کام لینے کا مقصد اور طریقہ متعین کرنے میں وہ مختار محض ہے، اور اُسکی تمام سعی و جہد کا منتہائے مقصود اِسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنی خواہشاتِ نفس کی خدمت کرے۔ معلومات کے اِس اساس پر مرتب ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکمت نظری اور حکمت عملی دونوں کا نشوونما خداپرستی کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے، یہی حکمت تمام دنیا کے قلوب و اذھان پر چھا جاتی ہے، اسی سے خالص مادہ پرستانہ اخلاقیات پیدا ہوتے ہیں، اسی پر انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے تمام ضابطے بنتے ہیں، اسی کے مطابق انسان اپنی حاصل شدہ قوتوں کا مصرف معین کرتا ہے، اور فی الجملہ ساری انسانی زندگی کا بہاؤ اِس راستہ کی طرف چل پڑتا ہے جسکی آخری منزلوں پر پہنچ کر اس دنیا ہی سے عذاب جہنم کی ابتدا ہو جاتی ہے جیسا کہ آج آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ناخداشناس حکمت جب تک دنیا کے افکار، اخلاق، تمدن، ہر چیز پر چھائی رہتی ہے، خداشناسی کے نقطۂ نظر اور اُس اخلاق و تمدن کے لیے جو اس نقطۂ نظر پر مبنی ہو، زمین و آسمان کے درمیان کوئی جگہ نہیں رہتی۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز اُسکے خلاف ہوتا ہے طبائع

کی افتاد اور مزاجوں کی پسند اسکے خلاف ہوتی ہے، انسانی معلومات کی بگڑی ہوئی ترتیب اسکے خلاف شہادت دیتی ہے، اخلاق کے سارے اصول اور قدر و قیمت کے سارے معیار اُس سے منحرف ہو جاتے ہیں، زندگی کے تمام ضابطے اور انسانی سعی و عمل کے سارے ہنگامے اسکو اپنے درمیان جگہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں، اور اس صورت حال میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ خدا پرستی کے مسلک کی ہر چیز دنیا میں نامقبول و نامعقول ہو کر رہ جاتی ہے، بلکہ خود وہ لوگ جو اس مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں فی الواقع اسکی پیروی کر نہیں سکتے، زندگی کے دریا کا بہاؤ زبردستی کھینچ کر ان کو اپنے راستے پر لے جاتا ہے، اور اسکے خلاف زیادہ سے زیادہ کشمکش وہ بس اتنی ہی کر سکتے ہیں کہ سر کے بل بہنے کے بجائے احتجاجاً پاؤں کے بل بہیں۔

جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے، اور جو کائنات فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اسکی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے۔ زمین پر اسکا تسلط ہوتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اُسکے قبضہ میں ہوتی ہیں۔ حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ دیسلیے انسانی حیات اجتماعی کا سارا کاروبار اُس ڈھنگ اور اُس نقشے پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جسکو یہ تسلط دنیا اور اسکے معاملات پر حاصل ہے، خدا سے پھرا ہوا ہو، تو اُسکے حیطۂ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو۔ جس گاڑی میں آپ بیٹھے ہوئے ہوں اگر اُس کا ڈرائیور اسے کلکتہ کی طرف لیجا رہا ہو تو آپ کراچی کی طرف جا ہی کب سکتے ہیں۔ چار و ناچار آپکو اسی طرف جانا پڑیگا جدھر ڈرائیور جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑینگے تو اتنا کر لینگے کہ اسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنا رخ کلکتہ سے کراچی کی طرف پھیر لیں، اور برضا و رغبت نہ سہی کشاں کشاں اُس منزل پر جا پہنچیں جو آپ کی منزل مقصود کے عین مخالف سمت میں واقع ہے۔

موجودہ صورت حال یہی صورت حال اسوقت فی الواقع درپیش ہے۔ آپکے امامت سے ہٹنے کے بعد جب یورپ نے علم کے میدان میں پیش قدمی کی تو ناگزیر اسباب نے اسکی نگاہ کا زاویہ خدا سے بیزاری (Theophobia) کی طرف پھیر دیا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے تمام سمعی معلومات کو جمع کیا، اسی نقطۂ نظر سے اس نے آثارِ کائنات کا مشاہدہ کیا، اسی نقطۂ نظر سے اس نے معلومات کو مرتب کرکے نتائج اخذ کیے، اسی نقطۂ نظر سے اس نے زندگی کے مقاصد، اخلاق کے اصول، تمدن کے ضوابط، اور انفرادی و اجتماعی برتاؤ کے ڈھنگ متعین کیے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس نے ان تمام قوتوں کے مصرف تجویز کیے جو اسے تحقیق و اجتہاد کی بدولت حاصل ہوئی تھیں۔ پھر جب اس علم کے زیر پروہ اٹھا تو ایک طرف زمینیں کی زمینیں اور قومیں کی قومیں اسکے آگے مسخر ہوتی چلی گئیں، اور دوسری طرف وہی علم، وہی ذہنیت، وہی مقاصد و غایات، وہی فکری ساخت، وہی اخلاقی روش، وہی تمدنی قواعد و ضوابط، غرض وہی سب کچھ جو اس امامِ غالب کے پاس تھا، تمام دنیا پر چھا گیا۔ اب حال یہ ہے کہ ایک بچہ جب سے ہوش سنبھالتا ہے اُسی وقت سے اسکے ذہن اور اسکی زندگی کی تعمیر اُس نقشہ پر ہونے لگتی ہے جو یورپ کی امامت میں بنا ہے۔ سمعی معلومات اُسی ترتیب سے اسکے دماغ میں اترتی ہیں، مشاہدہ کے لیے وہی نقطۂ نظر اسے ملتا ہے، نتائج اخذ کرنے کی ساری تربیت اُسی طرز پر اسے حاصل ہوتی ہے، حق اور باطل، صحیح اور غلط، مقبول اور مردود کی تعیین کے لیے بھی معیار اُسے میسر آتا ہے، اخلاق کے وہی اصول، زندگی کے وہی مقاصد اور سعی و عمل کے وہی راستے اُسکے سامنے روشن ہوتے ہیں، اپنے گرد و پیش زندگی کا سارا کارخانہ اُسی ڈھنگ پر اسے چلتا ہوا ملتا ہے، اور جب وہ اس طرح پروان چڑھنے کے بعد خود کارگاہِ حیات میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوتا ہے تو چونکہ یہی ایک مشین دنیا میں چل رہی ہے اور کوئی دوسری مشین چلنے والی موجود نہیں ہے، اسلیے اسی کا پرزہ اسکو بن جانا پڑتا ہے۔ ناخدا شناس تہذیب و تمدن کے اس کامل تسلط میں اول تو یہی سخت مشکل ہے کہ خدا پرستانہ نظریۂ حیات، مقصدِ زندگی اور اصولِ اخلاق کو دلوں اور دماغوں میں راہ مل سکے کیونکہ علوم و فنون کی ساری ترتیب اور زندگی

کی پوری روش اُسکے بالکل برعکس سمت میں پھری ہوئی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایسے نکل بھی آئیں جنکے ذہن میں یہ تخم جڑ پکڑ لے، تب بھی گردوپیش کی پوری فضا اسکو غذا دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسکو نہ کہیں علوم سے تائید ملتی ہے، نہ زندگی کے بنے اور جمے ہوئے نقشے اسکا ساتھ دیتے ہیں، نہ دنیا کے چلتے ہوئے معاملات ہی میں کہیں اسکی جگہ نظر آتی ہے۔ جس قدر معلومات گذشتہ پانسو برس کی مدت میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں انکو مرتب کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا سارا کام ناخدا شناس لوگوں نے کیا ہے۔ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے انکی ترتیب کا اور اخذ نتائج کا کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ فطرت کی جو طاقتیں اس دوران میں انسان کے لیے مسخر ہوئیں اور قوانین طبیعی کی مزید دریافت سے جو فوائد حاصل ہوئے ان سے بھی خدا پرستوں نے نہیں بلکہ خدا کے باغیوں نے کام لیا اسلیے ناگزیر تھا کہ تمدن انسانی میں ان سب کا مصرف وہی مقرر ہوتا جو انکے مقاصد زندگی اور اصولِ اخلاق کے مناسب حال تھا۔ اسی طرح اجتماعی معاملات کی تنظیم کے جتنے نظری خاکے اور عملی طریقے اس دوران میں سوچے اور عملاً چلائے گئے اُن سب کے سوچنے اور چلانے والے وہ دماغ اور وہ ہاتھ نہ تھے جن پر خدا پرستی کا مسلک فرمانروا ہوتا، بلکہ وہ تھے جو خدا کی اطاعت سے منحرف تھے، اسلیے نظریات اور عملیات کے میدان پر آج سارے کے سارے وہی نقشے چھائے ہوئے ہیں جو انہوں نے بنائے ہیں، اور ایسا کوئی نقشہ جو خدا پرستانہ مسلک کی بنیاد پر بنا ہو، عملاً تو کیا موجود ہوتا، نظریہ کی شکل میں بھی ایسی تفصیلی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں ہے جو آج کے حالات سے ربط کھاتا ہو اور جس میں آج کے مسائل حیات کا پورا پورا حل مل سکے۔ اب اگر اس مسلک پر اعتقاد رکھنے والا کوئی شخص راہب بن کر دنیا اور اسکی زندگی سے الگ تھلگ کسی گوشے میں جا بیٹھے اور پانسو برس پہلے کی فضا اپنے اوپر طاری کر لے تب تو بات دوسری ہے اور نہ اس دنیا کے معاملات میں ایک زندہ انسان کی حیثیت سے حصہ لینے کی صورت میں تو قدم قدم پر اسکے لیے مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ اپنے مسلک میں نیک نیت اور صحیح الاعتقاد ہونے کے باوجود بارہا وہ نادانستہ اُن فکری اور عملی راہوں پر چل پڑتا ہے، اور بار ہا اسے مجبوراً اُن راہوں پر چلنا پڑتا ہے

جو اسکے مسلک سے بالکل مختلف ہیں۔ نئی معلومات جب اسکے سامنے آتی ہیں تو اسکے لیے سخت دشوار ہوتا ہے کہ حقائق (facts) کو اُن ناخدا شناس لوگوں کے نقطۂ نظر اور اخذ کردہ نتائج سے الگ کر سکے جنہوں نے انکی دریافت، ترتیب اور استنتاج کا سارا کام انجام دیا ہے، اسلیے اکثر وہ اس طرح حقائق کے ساتھ ساتھ انکے نظریات اور نتائج کو بھی ہضم کر جاتا ہے کہ اسے اس امر کا شعور تک نہیں ہوتا کہ امرت کے ساتھ کتنا زہر اسکے اندر اتر گیا۔ اسی طرح زندگی کے عملی معاملات سے جب اسکو واسطہ پیش آتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ بہت سے اجتماعی نظریات جو فی الاصل اسکے مسلک کے خلاف ہیں، اُسکے دل و دماغ پر زبردستی چھا جاتے ہیں، کیونکہ دنیا میں ہر طرف چلن ہی ان کا ہے، بہت سے عملی طریقوں کو غلط سمجھنے کے باوجود محض اس بنا پر وہ اختیار کرتا ہے کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی دوسری راہ سوچ نہیں سکتا۔ اور بہت سی غلط راہوں پر اسے مجبوراً اس لیے چلنا پڑتا ہے کہ ان پر چلے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

انقلابِ امامت کے لیے انقلابِ تعلیم ناگزیر ہے

حضرات! یہ ہے وہ صورتِ حال جس میں اس وقت آپ مبتلا ہیں۔ میں نے اس صورتِ حال کا جو تجزیہ کیا ہے، اگر اس میں کوئی غلطی آپ پاتے ہوں، تو براہِ کرم مجھے بھی اس سے آگاہ فرمائیں تاکہ میں اس پر نظر ثانی کر سکوں۔ لیکن اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو اس سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

اولاً، ناخدا شناس ائمہ کی امامت میں رہ کر خدا شناسی و خدا پرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا لہذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اسکے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ثانیاً، جو نظام تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے اُس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کے لیے آپکو تیار کر سکے۔ لہذا اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ خدا پرستی

کا مسلک بتدریج مٹتے مٹتے دنیا سے فنا ہو جائے تب تو شوق سے اسی نظام تعلیم پر جمے رہیں، ورنہ اسے آپ کو بدلنا ہوگا۔

ثالثاً، جو نظام تعلیم تمام علوم کو اُسی ترتیب اور اُسی زاویۂ نظر سے لیتا ہے جو ناخدا شناس ائمہ کی ترتیب اور اُن کا زاویۂ نظر ہے، اور جو اُس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لیے انسان کو تیار کرتا ہے جو ان ائمۂ ضلال نے بنائی ہے، وہ در اصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہوسکتا کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی، یا اسلامیہ کالج، یا اسلامیہ ہائی اسکول کے الفاظ کا اطلاق کیا جائے۔ اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے لاکر جوڑ دینا ۹۵ فی صدی تو بالکل ہی لاحاصل ہے، اور ۵ فی صدی فائدہ اگر اس سے حاصل ہو بھی سکتا ہے تو وہ بیش ازیں نیست کہ لوگ کچھ مدت تک کفر کے راستہ پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں۔

رابعاً اصلاح تعلیم کا یہ لائحہ کہ علوم اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے، یہ بھی امامت میں انقلاب کرنے کے لیے آپکو تیار نہیں کرسکتا۔ اسلیے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت مدوّن و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور انکی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطۂ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصبات اور اھواء و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے اُن کو بطور خود مرتب کرکے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔ اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ، اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملاکر پڑھائینگے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہونگے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہوگا تو مولوی بن جائیگا۔ کوئی نئے علوم سے مفتوح ہوگا تو مسٹریت کی طرف چلا جائیگا بلکہ کامریڈیت تک جا پہنچے گا۔ کوئی دونوں کے

درمیان مذبذب ہوکر مضمحل ہوجائیگا۔ بہت ہی کم آدمی اِس نظامِ تعلیمی سے ایسے نکل سکتے ہیں جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بنا سکیں، اور ان کا بھی اس قدر طاقتور ہونا بہت مشکل ہے کہ اٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیں۔

یہ نتائج جو میں نے حالات کے تجزیہ سے اخذ کیے ہیں اگر ان میں کوئی غلطی ہو تو میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس سے آگاہ فرمائیں۔ لیکن اگر اِن نتائج کو بھی آپ تسلیم کرتے ہیں، تو اب میں کہتا ہوں کہ امامت میں انقلاب کرنے کی اسکے سوا کوئی صورت نہیں کہ اِن تینوں نظاماتِ تعلیمی سے ہٹ کر ایک بالکل نیا نظامِ تعلیم بنایا جائے جس کا نقشہ ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی مدارج تک تینوں سے مختلف ہو۔

نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ

اس انقلابی اصلاح کی ضرورت ثابت کرنے کے بعد میں اُس نظام کی تعمیر کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

پہلی خصوصیت سب سے پہلی چیز جو اس نئے نظام میں ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو اس میں یکجان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی، دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علحدگی کے تصور پر مبنی ہے، اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ دنیا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے، اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں، اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اسکی ہدایت کے مطابق ہو، اسی چیز کا نام دین ہے۔ اس تصورِ دین کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے۔ ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی رہیں، اور کچھ دوسرے علوم دینی ہوں اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں، تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ نشو و نما پائیگا کہ دنیا کسی اور چیز کا نام ہے

پہلے عنوان کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے پوری تاریخ اسلام پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنکی نظر تاریخِ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق اور باریک فرق تک پہنچی اور جس نے تاریخ مسلمین پر تاریخ اسلام کے نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے۔ یہ ایک ایسا نازک مضمون ہے جسکی پیچیدگیوں میں پہلے بھی لوگ الجھے رہے ہیں اور اب تک الجھے ہوئے ہیں، چنانچہ شاہ صاحب کے بعد بھی کوئی ایسا صاحبِ نظر نہ اٹھا جسکے ذہن میں حقیقی تاریخ اسلام کا تاریخ مسلمین سے الگ، کوئی واضح تصور ہوتا۔ شاہ صاحب کے کلام میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق اشارات موجود ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ ازالۃ الخفا کی فصل ششم میں انہوں نے صفحہ ۱۲۲ سے صفحہ ۱۵۸ تک[1] مسلسل تاریخ مسلمین پر تبصرہ کیا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ایک دور کی خصوصیات اور ایک ایک زمانہ کے فتنوں کو بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن پیشینگوئیوں کو بھی نقل کرتے گئے ہیں جن میں ان حالات کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس تبصرہ میں قریب قریب اُن تمام جاہلی آمیزشوں کی نشان دہی ہوگئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد، افکار، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہیں۔

پھر شاہ صاحب نے خرابیوں کے اس ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں بنیادی خرابیاں کونسی ہیں جن سے باقی تمام خرابیوں کا شجرۂ نسب ملتا ہو، اور آخر کار دو چیزوں پر انگلی رکھ دی ہے۔ ایک اقتدار سیاسی کا خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال، دوسرے روح اجتہاد کا مردہ ہو جانا اور تقلید جامد کا دماغوں پر مسلط ہو جانا۔

پہلی خرابی پر انہوں نے ازالہ میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ خلافت اور بادشاہی کے اصولی و اصطلاحی فرق کو جس قدر واضح صورت میں انہوں نے بیان کیا ہے اور جس طرح احادیث سے اسکی تشریح کی ہے، اسکی کوئی مثال ان سے پہلے کے مصنفین کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اس انقلاب

۱۔ ہمارے پیش نظر ۱۲۸۶ھ کا نسخہ [illegible] مطبوعہ ہے

نقشہ بنانا مشکل ہوگا۔ وہ خواہ کتنا ہی پختہ ایمان لے آئے مگر بہر حال اسکے لیے دین عین اسکی زندگی نہ ہوگا بلکہ زندگی کا ایک ضمیمہ ہی بن کر رہ جائیگا۔

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظام تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں، بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ شروع ہی سے ایک بچہ کو دنیا سے اس طرح روشناس کرائیے کہ گویا وہ خدا کی سلطنت میں ہے، اسکے اپنے وجود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں، ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور قدرت کے آثار دیکھ رہا ہے، اُس کا اور ہر شئے کا براہ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جو آسمان سے زمین تک تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے، دنیا میں جتنی قوتیں اسکو حاصل ہیں اور جو اشیاء اسکے لیے مسخر ہیں، سب کی سب خدا نے اسکو دی ہیں، ان سب سے خدا کی مرضی کے مطابق اور اسکے بتائے ہوئے طریقہ پر اسے کام لینا ہے اور اپنے اس کام کی جواب دہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے۔

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطۂ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے۔ البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اسکے سامنے اس طرح آنے چاہییں کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہو، مگر اسکے مخالف دوسرے تمام نظریات بھی پوری تنقید و تنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اسکے آگے رکھ دیئے جائیں کہ یہ ضالین اور مغضوب علیہم کے نظریات ہیں۔ اسی طرح عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقاصدِ حیات، اصول اخلاق اور مناہج عمل اسلام کے پیوست کیے جائیں اور دوسروں کے اصول و طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو پڑھائے جائیں کہ اُنکی فکری اساس، منزلِ مقصود اور راہِ عمل اسلام سے کتنی اور کس کس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ ہے تمام علوم کو دینی علوم میں تبدیل کر دینے کا، اور جب اس طریقہ سے تعلیم دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس میں دینیات کے لیے کسی علحدہ

کورس کی کوئی حاجت ہی نہیں پیش آسکتی۔

دوسری خصوصیت | دوسری اہم خصوصیت جو اس نظام تعلیمی میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو مجموعۂ علوم بنانے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتوے کا مجاز قرار دے دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے، ختم کردیا جائے، اور اسکی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کرچکا ہے، اور اتنے شعبے اُس میں پیدا ہوگئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھ لینا محال ہے، اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شد بود اُسے کرادی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہوسکتا۔ اسکے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں وہ اسکو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دیدی جائیں۔ اسکے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہیے، زندگی کا وہ خاکہ جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہوجائیں جنکی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے، اور وہ ان سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقہ پر برتنے کے لیے تیار ہوجائے۔ اسے اپنی مادری زبان بھی آجائے۔ عربی زبان بھی اتنی سیکھ لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے۔ اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہوجائے تاکہ معلومات کے اُس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکے جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اسکے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کرکے ایک طالب علم اُس شعبۂ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے جسکی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر میں چند شعبوں اور انکے طریق تعلیم کی تشریح کرونگا جس سے آپ اندازہ کرسکینگے کہ میرے ذہن میں اس اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے۔

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن

کا فلسفہ پڑھایا جائے تاکہ اس ذریعہ سے وہ معلوم کرے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسوس ہوتی ہیں انکی تہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی کیا سبیل ہے، عقل انسانی کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدود سے وہ محدود ہے، مجرّد استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے میں انسان کس طرح واقعات اور حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیال کی تاریک دنیا میں گم ہو جاتا ہے، مابعد الطبیعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لیے فی الواقع ضروری ہے، اُس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ (observation) اور استقراء (Induction) سے کس طرح کام لینا چاہیے، کن امور مابعد الطبیعت کا تعین ہم کر سکتے ہیں، کن کے متعلق ایک مجمل اور مطلق حکم سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے، اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقیید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد ہو جاتی ہے بلکہ انسان کو تخیلاتِ لاطائل کی بھول بھلیاں میں بھٹکا دیتی ہے۔ اس بنیاد کو مستحکم کر لینے کے بعد طالب علم کو تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرایا جائے اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اسکو تمام مذاہب فلسفہ کی سیر کرادی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو ذرائع انسان کو دیے گئے تھے اُن سے کام نہ لے کر یا اُن سے غلط طریقہ پر کام لیکر کس طرح انسان بھٹکتا رہا ہے، کس طرح اس نے اوہام کو حقیقت سمجھا اور اس سے کس طرح اسکی زندگی متاثر ہوئی، کس طرح اس نے اپنی پہنچ ماوراء چیزوں کے متعلق رجماً بالغیب حکم لگائے اور اسکے کیا اثرات زندگی پر مترتب ہوئے، کس طرح اس نے اپنے حواس اور اپنی عقل کی حدود کا تعین کیے بغیر اُن حقیقتوں کا تعین کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کا تعین اسکے بس کی چیز ہی نہ تھا، کہاں ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی، کہاں سے یونانی فلسفہ بھٹک نکلا، کدھر مسلمان فلاسفہ قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے، متکلمین کے مختلف اسکولوں نے صدیوں تک جن مسائل پر بحثیں کیں اُن میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز تھا، فلسفیانہ تصوف کے مختلف مذاہب نے مجمل کو مفصل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس طرح کوششیں کیں اور وہ کس قدر غلط تھیں، یورپ میں فلسفیانہ تفکر نے کیا کیا راہیں اختیار کیں، ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کتنے مختلف مذہب بن گئے، ان مختلف

مذاہب میں حق کتنا ہے اور باطل کی آمیزش کتنی ہوئی اور کن راہوں سے آئی، کون سے مابعد الطبیعی تصورات ہیں جنہوں نے یورپ میں جڑ پکڑلی ہے، اُن سے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تو فضول دماغی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پر زندگی تعبیر کرنے سے کس طرح دنیا بچ سکتی تھی۔ اس تمام مطالعہ کے بعد طالب علم اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے، اور جب اہل علم کی جرح و تنقید کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کردے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند دے کر چھوڑ دیا جائے۔

ایک دوسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کا فلسفۂ تاریخ، مقصدِ مطالعۂ تاریخ اور طرزِ مطالعۂ تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں، وہ حقائق کو بے رنگ نگاہ سے دیکھنے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کے لیے مستعد ہو جائے، نوعِ انسانی کی سرگذشت اور تہذیب انسانی کے نشو و ارتقاء کا مطالعہ کرکے انسان کی فلاح و خسران اور سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے مستقل اصول مستنبط کرے، مداولت ایام بین الناس جس ڈھنگ پر اور جس ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے اسے معلوم کرے، جو اوصاف انسان کو اوپر اٹھاتے ہیں اور جو اسے نیچے گرا دیتے ہیں اُن سے واقف ہو، اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتدا سے آج تک سیدھا کھنچا ہوا نظر آتا ہے جو انسان کی ترقی کا اصلی راستہ ہے، اُس خط سے ہٹ کر جو بھی دائیں یا بائیں جانب دور نکل گیا اسے یا تو ٹھوکر کھا کر اُسی کی طرف پلٹنا پڑا ورنہ ایسا پھینکا گیا کہ پھر اس کا کچھ پتہ نشان نہ ملا۔ اس طرز مطالعہ سے جب طالب علم کو معلوم ہو جائیگا کہ خدا کا قانون کس قدر بے لاگ ہے، اور کیسی غیر جانبداری کے ساتھ اس نے قوموں سے معاملہ کیا ہے، تو کوئی قوم بھی نہ اسکی چہیتی رہیگی اور نہ کسی کے خلاف اسکے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہیگا۔ جس قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر ڈالے گا بے لاگ طریقے سے ڈالیگا اور فلاح و خسران کے ابدی اصولوں کی کسوٹی پر کس کر کھرے کو الگ اور

کھوٹے کو الگ کر کے سامنے رکھ دیگا - اس تربیت ذہنی کے بعد اسے تاریخی دستاویزوں، اور آثار قدیمہ اور مآخذ اصلیہ سے بطور خود واقعات معلوم کرنے اور بطور خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی جائے، اور اتنا تیار کر دیا جائے کہ وہ جاہلی مورخین کے چڑھائے ہوئے رنگوں سے اصل حقائق کو الگ کر کے خود بے لاگ رائیں قائم کر سکے -

ایک اور شعبہ علوم عمران (social sciences) کا ہونا چاہیے، جس میں پہلے قرآن اور حدیث سے تمدن انسانی کے بنیادی اصول بتائے جائیں - پھر تفصیل کے ساتھ اصول سے فروع کا استنباط کر کے اور انبیاء کی رہنمائی میں جو تمدن بنے تھے ان کے نظائر سے استشہاد کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ ان قواعد اصلیہ (fundamental principles) پر کس طرح ایک صالح نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام سیاست، تدبیر مملکت، اور تعلقات بین الاقوام کی عمارت اٹھتی ہے - پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح انہی اصولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے، اور انسانی علم کی ترقی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں اور تمدن کے فطری نشو و نما سے جو نئے طرز عمل پیدا ہوتے ہیں ان سب کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس صالح تمدن میں جذب کرنے اور اپنے اپنے ٹھیک مقام پر رکھنے کی کیا صورت ہے - اسکے ساتھ ایک طرف طالب علم کو پچھلی قوموں اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے کہ تمدن کے ان اساسی اصول اور الہٰی حدود کے قریب رہنے، اور ان سے انحراف کرنے سے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں - اور دوسری طرف اسے دور جدید کے سیاسی، معاشی، اجتماعی نظریات و عملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے کہ انسان نے الہٰی ہدایت سے بے نیاز بن کر بطور خود اپنی زندگی کے لیے جو راستے تجویز کیے ہیں وہ کہاں تک اس کے لیے موجب سعادت یا شقاوت ہیں -

سائنس کی مختلف شاخوں کے لیے چند شعبے علحدہ ہونے چاہییں جن میں قرآن کی رہنمائی

سے فائدہ اٹھاکر نہ صرف ابتک کی جمع شدہ سائنٹفک معلومات کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثار فطرت کے مزید مشاہدہ اور قوانین فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی اُنہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دیے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے نہ اسکے موضوع کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے، لیکن چونکہ یہ اُسی مصنف کی تصنیف ہے جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے، اس لیے اسکے گہرے مطالعہ سے سائنس کے ایک طالب علم کو نہ صرف نظامِ کائنات کا بنیادی فارمولا معلوم ہوجاتا ہے، بلکہ قریب قریب ہر شعبۂ علم میں اسے ایک صحیح نقطۂ آغاز (Starting point) اور تلاش و تجسس کے لیے ایک صحیح رخ (Direction) بھی ملتا ہے۔ یہ وہ شاہ کلید (Master key) ہے جس سے سائنس کی ہر گتھی بآسانی حل کی جاسکتی ہے، جس سے تحقیق کا سیدھا راستہ صاف کھل جاتا ہے، جسکی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے تو اس کا بہت سا وقت گتھیوں کو سلجھانے اور سلجھاتے سلجھاتے خود الجھ جانے میں ضائع نہ ہو۔ موجودہ سائنس کی گمراہی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ حقائق واقعیہ کے مشاہدے کی حد تک تو ٹھیک رہتا ہے مگر جب ان حقائق کو جوڑ کر ان سے نظریات بناتا ہے تو کائنات فطرت کے مبدا و غایت سے ناواقف ہونے کے باعث ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے، اور اس سے نہ صرف بہت سی انسانی قوت فضول ضائع ہوتی ہے بلکہ ان غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کرکے عملیات کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے تو وہ فساد تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ حقائق کو نظریات سے الگ کرکے مرتب کریگا اور مزید حقائق دریافت کرکے اُن سے بہتر نظریات و نتائج نکال کر بتائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اِن سائنٹفک گمراہیوں کو چھوڑنے پر مجبور نہ ہوجائے جن میں آج وہ مبتلا ہے۔

جن علوم کو اِس وقت علوم دینی کہا جاتا ہے ان کے لیے بھی الگ شعبے مخصوص ہونے چاہییں

مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے، مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی جائے اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں روز افزوں بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیے جس میں قدیم محدثین کے کام سے پورا استفادہ کرنے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے، دورِ سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں، اور ان سے وہ نتائج اخذ کیے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کے احکام، حدیث نبوی کی قولی و عملی تشریحات، صحابۂ کرام اور تابعین کے اجتہادات، اور ائمہ مجتہدین کے طرزِ استنباط اور جزئیات میں انکی تفریعات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے، نیز دنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے، اور زندگی کے روز بدلنے والے مسائل و معاملات پر اصول قانون اسلامی کو منطبق کر کے فقہ کے اُن چشموں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ شعبے نہ صرف بجائے خود بہت عظیم الشان کام انجام دینگے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے متعلق انہی سے وہ مواد ملیگا جسکی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائیگا۔

تیسری خصوصیت میں نے یہ چند شعبے محض تمثیلاً بیان کیے ہیں جن سے پورے نقشے کی تفصیلات کا ایک تصور بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب میں اس نئے نظام تعلیمی کی آخری مگر نہایت اہم خصوصیت کا ذکر کرونگا، اور وہ یہ ہے کہ اس میں وہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی جو آج کل ہندوستان میں دی جا رہی ہے، بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور منتہائے سعی و عمل ہوگا، یعنی یہ کہ ان سب کو مسلک خدا پرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرنا ہے۔ یہ مقصد اُس نظام کی ہر چیز میں اسی طرح کام کریگا جس طرح انسانی جسم کی ہر رگ اور ہر ریشے اور ہر حرکت میں اُسکی روح کام کرتی ہے۔ طلبہ کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات، اور اُنکے درس میں

و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کارفرمائی ہوگی، اسی کے مطابق انکی سیرت و کردار کی تعمیر کی جائیگی، اسی پر انکے اخلاق ڈھالے جائینگے، اور تمام ماحول ایسا بنایا جائیگا کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کردے۔

متوقع نتائج اس قسم کی تربیت اور اس قسم کی تعلیم پاکر جو لوگ تیار ہونگے ان میں یہ طاقت ہوگی کہ واقعات کی رفتار بدل دیں۔ انکی محققانہ تنقید جاہلیت کے علوم اور جاہلی تہذیب کی ساری بنیادوں کو ہلا دے گی انکے مدون کیے ہوئے علوم میں اتنا زور ہوگا کہ جو لوگ آج جاہلیت کے نقطۂ نظر پر جمے ہوئے ہیں ان کو وہ اسلامی نقطۂ نظر کی طرف پھیر لائینگے۔ ان کی تحقیق کے نتائج یورپ اور امریکہ اور جاپان تک کو متاثر کرینگے اور ہر طرف سے معقول انسان انکے نظریات کی طرف کھنچے چلے آئینگے۔ ان کا مرتب کیا ہوا نظریۂ حیات اور لائحۂ زندگی اتنی قوت کے ساتھ فکر و نظر کی دنیا پر چھا جائیگا کہ عمل کی دنیا میں اسکے خلاف کسی دوسرے لائحہ کا چلنا مشکل ہوگا۔ پھر اسی تعلیم سے اُس سیرت اور اُس عزم کے لوگ پیدا ہونگے جو امامت کے نظام میں عملاً انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ اس انقلاب کے فن کو بھی جانتے ہونگے، ان میں اسکے برپا کرنے کا مضبوط داعیہ بھی ہوگا، اور انہیں اپنی انقلابی تحریک کو خالص اسلامی راہوں پر چلانا بھی آتا ہوگا۔ پھر انہی میں یہ اہلیت بھی ہوگی کہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر اسلامی اصول کے مطابق ایک اسٹیٹ ایک مکمل نظام تمدن کے ساتھ بنا کھڑا کریں جسکی شکل اور روح اسلامی ہو اور جو دنیا میں امامت کرنے کی پوری طاقت و صلاحیت رکھتا ہو۔

عملی مشکلات حضرات! اس مرحلہ پر پہنچ کر تین کٹھن سوالات سامنے آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے یہ معروضات سننے کے دوران ہی میں ان سوالات نے آپ کے دلوں میں خلش پیدا کرنی شروع کردی ہوگی۔

نصاب اور معلمین کی تیاری پہلا سوال یہ ہے کہ یہ نیا نظام قائم کیسے کیا جاسکتا ہے جبکہ اس نئے طرز پر

نہ تو پڑھانے والے ہی اس وقت کہیں مل سکتے ہیں اور نہ ایسی کتابیں ہی موجود ہیں جن سے کسی ایک شعبۂ علم کی تعلیم بھی اس نقشہ کے مطابق دی جاسکے، بلکہ شائد مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ پہلی جماعت کے بچے کو بھی اس طرز کی تعلیم دینے کے لیے کسی مدرس اور کسی کتاب کا ملنا اس وقت مشکل ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایک نئی عمارت بنانے کے لیے بھٹہ تیار کرنا پڑتا ہے تاکہ اینٹیں پکائی جائیں اسی طرح ایک نیا نظام تعلیم بنانے کے لیے بھی ایک تربیت گاہ بنانا ضروری ہے تاکہ اس میں وہ آدمی تیار کیے جائیں جو اس خاص طریقہ کی تعلیم دینے کے قابل ہوں۔ اینٹیں بھی تو آپ کو پکی پکائی نہیں ملتیں۔ پکانی پڑتی ہیں۔ آدمی بھی آپ کو بنے بنائے نہیں ملینگے۔ بنانے پڑینگے۔ اسی ناقص تعلیم سے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی فارغ ہو کر نکلے ہیں جو فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوئے ہیں کافر گر تعلیم و تربیت کے سارے مرحلوں سے گذرنے کے باوجود اپنا ایمان بچالائے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اور مقصد زندگی اسلامی ہے یا ذراسی محنت سے خالص اسلامی بنایا جاسکتا ہے۔ ان میں یہ طاقت بھی موجود ہے کہ جس مقصد پر وہ ایمان لائے ہیں اسکی راہ میں جفاکشی کرسکیں۔ ان میں اجتہادی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ایسے لوگوں کو لیکر اگر خاص قسم کی ذہنی و اخلاقی تربیت دی جائے، اور معلومات جس ترتیب سے اُنکے ذہن میں اب تک جمع ہوتی رہی ہیں اُسکو ذرا حکمت کے ساتھ بدل دیا جائے، اور زاویۂ نگاہ اچھی طرح اسلام کی سمت میں جما دیا جائے، تو یہی لوگ تحقیق و مطالعہ سے اس قابل ہوسکتے ہیں کہ علوم کو میرے بیان کردہ نقشہ کے مطابق از سرِ نو مدوّن کرنا شروع کردیں۔ پھر جب تدوین علوم کا کام کسی حد تک انجام پاجائے تو ایک نمونہ کی درسگاہ ابتدائی تجربوں کے لیے بنائی جاسکتی ہے، اور بعد میں آہستہ آہستہ اسے ترقی دیکر یونیورسٹی کے مرتبہ تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

متعلمین کی فراہمی دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قسم کا نظامِ تعلیم اگر قائم بھی کردیا جائے تو اس میں جاذبیت کونسی ہوگی جو پڑھنے والوں کو اسکی طرف کھینچے گی؟ جو نظامِ تعلیم موجودہ نظامات تمدن و سیاست کی خدمت

کے لیے نہیں بلکہ ان سے لڑنے کے لیے بنایا جائے اس میں شریک ہونے والے کو یہ تو امید ہو ہی نہیں سکتی کہ کل وہ وہاں سے نکل کر کچھ کما کھائیگا، پھر کتنے ایسے لوگ ہونگے جو کمانے سے بے نیاز ہو کر اس تعلیم کو حاصل کرنے کے لیے آئینگے جسکے بعد دنیوی لحاظ سے کوئی شاندار مستقبل نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں حق اور صداقت کے سوا کوئی کشش نہیں ہے اور کسی دوسری کشش کی حاجت بھی نہیں۔ جن لوگوں کے لیے اس چیز میں جاذبیت نہ ہو اور صرف روٹی ہی جنکو کھینچ سکتی ہو انکی توجہ فرمائی سے یہ نظامِ تعلیم خود بھی اتنا ہی بے نیاز ہوگا جتنے وہ اس سے بے نیاز ہیں۔ اسکے لیے تو وہ لوگ درکار ہیں جو جان بوجھ کر اُس مقصد اور اُس کام کے لیے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی وقف کرنے پر تیار ہوں جسکے لیے یہ نظامِ تعلیم بنایا جائیگا۔ اور ایسے لوگ بالکل ہی مفقود نہیں ہیں۔ تمام ہندوستان سے کیا پچاس بچے بھی ہر سال اس کام کے لیے نہ مل سکینگے؟ اگر اتنے بچے بھی وہ قوم فراہم نہیں کر سکتی جو مدتوں سے اسلام اسلام چیخ رہی ہے تب بھی کچھ پروا نہیں۔ اللہ دوسری قوموں کو یہ سعادت بخشے گا۔

مال کا سوال تیسرا اور آخری سوال یہ ہے کہ اس کام کے لیے مال کہاں سے آئیگا؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اُن لوگوں کے پاس سے جو مال اور ایمان دونوں رکھتے ہوں اور اتنی عقل بھی رکھتے ہوں کہ اپنے مال کا صحیح مصرف سمجھ سکیں۔ ایسے لوگ بھی اگر اس قوم میں نہ پائے گئے جو رات دن اسلام کے ورد میں تڑپ رہی ہے تو میں پھر یہی کہونگا کہ کچھ پروا نہیں، اللہ دوسری قوموں میں سے ایسے آدمی پیدا کریگا۔ آخر پہلے بھی تو کفر و شرک ہی کی گود سے وہ اللہ کے بندے نکل کر آئے تھے جنکی مالی قربانیوں سے دنیا میں اسلام کا فروغ ہوا۔

تفریق دین و سیاست

(۲)

از جناب مولانا ابوالحسن علی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

بہرحال جو دن یورپ میں ضروری طور پر آیا تھا ٹرکی میں غیر ضروری طریقہ سے آگیا۔ ۱۹۲۰ء کے انتخابات میں تو علمِ دین سے واقفیت رکھنے والے کچھ لوگ منتخب ہو گئے تھے اور انہوں نے تین سال تک قومی مجلس عالیہ میں دوسرے نمائندوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ مگر ۱۹۲۳ء کے انتخاب میں یہ لوگ میدان سے ہٹا دیے گئے اور پوری اسمبلی میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ رہا جو اسلام کو کچھ بھی جانتا ہو۔ اس کے بعد راستہ صاف تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ریاست اور مذہب کی تفریق پایۂ تکمیل کو پہنچا دی گئی۔ شیخ الاسلام کا عہدہ توڑ دیا گیا اور امور مذہبی کا محکمہ وزیر اعظم کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ وزارت اوقاف توڑ دی گئی اور اس کا کام وزارت مالیات کے سپرد کر دیا گیا۔ جو مذہبی مدارس وزارت اوقاف کے ماتحت تھے وہ بند کر دیے گئے۔ ۱۹۲۵ء سے انتہا پسند عنصر غالب ہو گیا۔ اس نے تغیرات (تجدد پسندوں کی زبان میں "اصلاحات") کو سختی سے جاری کیا۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامی قانون ترکوں کی زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کر دیا گیا۔ تجارتی قانون جرمنی سے لیا گیا فوجداری قانون اٹلی سے اور دیوانی قانون سوئٹزرلینڈ سے۔ اب ترکوں کی وراثت تک شرعی طریقہ سے تقسیم نہیں ہوتی اور ان کا نکاح اور طلاق تک شریعت کی پابندی سے آزاد ہے۔ گویا کفار کی حکومت کے ماتحت جس حد تک شرع اسلامی کا نفاذ ہم ہندی غلاموں کی زندگی میں ہوتا ہے "آزاد" ترکوں کی زندگی میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۸ء میں ایک قدم اور بڑھایا

گیا۔ عربی رسم الخط موقوف کر کے ترکی زبان کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا گیا تاکہ ترکوں کا رشتہ اُس تہذیب، اُن خیالات، اُس لٹریچر اور اُس ماضی سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے جس کا تعلق عربی رسم الخط کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ اذان ترکی زبان میں جاری کی گئی اور کوشش کی گئی کہ نماز بھی ترکی ہی میں ادا کی جائے۔ یہ یورپ کی تاریخ کا سبق تھا جو ترکی میں دہرایا گیا۔ جس طرح لوتھری تحریک کے بعد ہر قوم نے اپنا قومی چرچ الگ بنانا شروع کر دیا تھا، اسی طرح اِن نادان انقلابیوں نے چاہا کہ ترکی قوم بھی اپنا قومی مذہب الگ بنا لے۔

خالدہ خانم اگرچہ خود بھی کچھ بہت صحیح الخیال مسلمہ نہیں ہیں، تاہم مذہب و ریاست کی اس تفریق کے متعلق انکی یہ رائے قابل ملاحظہ ہے:۔

> "اس قانون پر کھلا ہوا اعتراض یہ ہے کہ گو اس نے ریاست کو مذہب کے سیاسی اثر سے آزاد کر دیا مگر مذہب کو ریاست کے سیاسی اثرات کا پابند بنا کر رکھ دیا۔ جو لوگ ابتدا میں مذہب و ریاست کی تفریق کے حامی تھے انہیں یہ امید تھی کہ مذہب آزاد ہو جائیگا۔ اس میں خالص روحانیت کی شان پیدا ہو جائیگی اور وہ پہلے کی طرح لوگوں کی اخلاقی تعلیم و تہذیب کا کام انجام دیگا۔ مگر نئے قانون کی رو سے ترکی میں عیسائی اور یہودی تو اپنے مذہبی امور میں بالکل آزاد ہیں اور مسلمانوں کا مذہب حکومت کا دست نگر ہے۔"

اب ان ترکوں سے کون کہے کہ تم نے یہ حرکات کر کے کس قدر سخت نادانی کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ تمہارے رہنماؤں میں کوئی قرآن اور سنت کا جاننے والا نہ تھا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ تم میں کوئی یورپ کی تاریخ کو سمجھنے والا اور کوئی واقعات کے اندر حقیقی اسباب و علل کو دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ تم میں کوئی اتنی سی بات سمجھنے والا بھی نہ تھا کہ یورپ نے تجربہ سے جس مذہب

کو انتظام دنیا کے ناقابل پایا وہ مسیحی مذہب تھا نہ کہ وہ مذہب جس نے ابو بکر و عمر کی قیادت میں دنیا کا بہترین نظام حکومت چلا کر دکھا دیا۔ تم میں کوئی دنیا کی تاریخ سے اور یورپ کی جدید ترین تاریخ سے اتنا سبق حاصل کرنے والا بھی نہ تھا کہ اخلاق و دیانت سے سیاست کا رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد صرف شیطنت، درندگی اور حیوانیت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ شاعر حکیم اقبال نے کہا ہے:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہندوستان میں علماء کی سیاسی خدمات دوسرے مسلم ممالک کی بہ نسبت ہندوستان اس لحاظ سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ یہاں علماء حق کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا اور رہونار ہا جو ضروریات وقت کے مطابق دین کی خدمت کے لیے مستعد ہوا۔ سیاسی بیداری، معاملہ فہمی اور قوت عمل کے اعتبار سے ہم کو کسی دوسرے ملک کے علماء کا اتنا شاندار ریکارڈ نہیں معلوم جتنا ہندوستان کے علماء کا ہے، نہ صرف دوسرے مسلم ممالک کے علماء کے مقابلہ میں بلکہ اپنے ملک کے دوسرے مسلمان طبقوں اور مسلمان سیاسی جماعتوں کے مقابلہ میں بھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ تاریخی حقیقت نیا انکشاف ثابت ہوگی اس لیے ہم کو تفصیل کی اجازت دیجائے۔

ہم اس سلسلہ میں مولانا سید احمد شہیدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں سیاسی بیداری اور جہاد و تنظیم کی اتنی بڑی پہلی تحریک تھی کہ اسوقت تک ہندوستان میں مسلمانوں میں اتنی وسیع دور رس، ہمہ گیر اور منظم تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ اور یہ تحریک سراسر علماء دین کی تحریک تھی۔

مولانا سید احمد شہیدؒ نے مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان اور سلسلہ کے علماء، نیز ہندوستان کے دیندار طبقہ کی رفاقت اور اعانت سے تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان میں جہاد و احیاء خلافت اسلامیہ کی تحریک شروع

کی، اور ہندوستان کے شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک مسلمانوں میں عام مذہبی جوش، سرفروشی کا جذبہ، اور سیاسی بیداری پیدا کردی۔ اس تحریک سے ہندوستان کے لاکھوں مسلمان وابستہ تھے اور سارے برطانوی علاقہ میں اس کے مرکز قائم تھے۔ سید صاحبؒ نے اپنا اصل مرکز ہندوستان کی شمالی سرحد کو بنایا جو ایک آزاد اور جنگجو علاقہ تھا اور جس سے آزاد مسلم سلطنتوں اور قوموں کا علاقہ متصل تھا۔ اُس وقت تک آپ کا محاذ جنگ پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف تھا جسکے علاقہ میں مسلمان مذہبی آزادی اور شہری حقوق سے محروم تھے۔ لیکن آپؒ کا ارادہ تھا کہ قوت کے فراہم ہوجانے اور مرکزیت قائم ہوجانے کے بعد رفتہ رفتہ ہندوستان میں ایک آزاد شرعی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے اور غیر مسلم اقتدار کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ کو ابتدا میں پوری کامیابی ہوئی۔ ۱۲ار جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سرحدی قبائل امرا و خوانین، ہندوستانی مجاہدین اور علماء و مشائخ نے بالاتفاق آپکے ہاتھ پر بیعت امامت و خلافت کرلی۔ بیت المال قائم ہوگیا۔ زکوٰۃ و عشر کا نظام اور شرعی حدود و تعزیرات جاری ہوگئے۔ کچھ مدت اور متعدد جنگوں کے بعد پشاور مفتوح ہوکر نئی اسلامی حکومت میں داخل ہوگیا۔

لیکن پھر مسلمانوں کی خیانت اور غداری اور ناسازگار حالات کے سبب مجاہدین اسلام کو شکست ہوئی۔ ۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء کو سید صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ بعض دوسرے رفقاء و مجاہدین کیساتھ مقام بالاکوٹ (ہزارہ) میں شہید ہوگئے اور آپکی باقیماندہ جماعت نے سرحد میں ستھانہ اور ہندوستان میں پٹنہ میں اپنا مرکز قائم کرلیا۔

سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی شہادت سے یہ آگ بجھی نہیں بلکہ زیر خاک اور پھیل گئی۔ ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ اپنی کتاب "جدید دنیاء اسلام" میں لکھتا ہے:-

"شمالی ہند میں ایک وہابی جانباز سید احمد نے پنجابی مسلمانوں کو ابھار کر حقیقتہً

ایک مذہبی سلطنت قائم کرلی مگر انکی ناگہانی موت (؟) سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا۔ اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۳۰ء میں برباد کردیا۔ لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کو فتح کیا تب بھی وہابی عقائد کی سلگتی ہوئی چنگاریوں نے بہت کچھ پریشان کیا۔ یہ خیالات عرصہ تک باقی رہے اور اسباب غدر میں ممد ہوئے اور انہی عقائد نے افغانستان اور شمالی مغربی سرحد کے وحشی قبائل کو ہمیشہ کے لیے مذہبی تعصب میں رنگ دیا۔"

ہندوستان کے مرکز صادق پور پٹنہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ بے نظیر تنظیم، اور جہاد کی وہ عظیم الشان تبلیغ و تربیت کی جسکی مثال مسلمانوں کے داخلہ ہند سے لیکر اس وقت تک نہیں ملتی۔ اس تنظیم و تبلیغ کی وسعت، اس اسلامی نظام کی برتری، اور ان علماء کی سیاسی قابلیت اور انتظامی لیاقت کا تصور کرنے کیلیے اس تحریک کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی کتاب "مسلمانان ہند" کے مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھنے چاہئیں :-

"یہ لوگ مشنریوں کی طرح ان تھک کام کرتے تھے۔ بے لوث اور بے نفس لوگ تھے جنکا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ روپیہ اور آدمی فراہم کرنے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔"

"میرے لیے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں۔ ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لیے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے۔"

مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی امیر جماعت کے متعلق لکھتا ہے :-

"امیر جماعت یحییٰ علی کے مختلف فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں فرقہ کے روحانی

رہنما کی حیثیت سے تمام جماعتی مبلغین سے خط و کتابت رکھتے تھے اور انہوں نے ایک اصطلاحی زبان میں چند مبہم عبارتیں ترتیب دی تھیں جنکو وہ خود استعمال کرتے اور جنکے ذریعہ وہ اطمینان سے بڑی بڑی رقمیں سلطنت کے مرکز سے سرحد پار باغیوں کے کیمپ (ستھانہ) بھیجتے تھے۔ وہ مسجدوں میں وعظ و تقریر کرتے اور مذہبی دیوانوں کی فوج کو بندوقیں جانچ کر بھیجتے۔"

"لیکن اس سازش کا سب سے زیادہ نازک کام پٹنہ (یا بالفاظ خود چھوٹی خانقاہ) سے سرحد پار باغیوں کے مرکز (بڑی خانقاہ) کو رنگروٹ بھیجنا تھا۔ بنگالی متبعین کو راستہ میں صدہا بے تکے اور پریشان کن سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ انکو پنجاب اور شمالی مغربی ہندوستان کے وسیع صوبوں میں سے ہوکر تقریباً دو ہزار میل کا سفر طے کرنا ہوتا تھا جہاں ہر گاؤں میں انکی جسمانی شکل اور زبان ان کو اجنبی ثابت کرتی تھی۔ اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی ذہانت اور انتظامی قابلیت کام کر رہی تھی۔ انہوں نے تمام راستہ پر اپنے وہابی پیر متعین کر دیئے تھے جو جماعت کے معتبر اشخاص کے ماتحت تھے۔ یحییٰ علی کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے کہ ان کے انتخاب کیے ہوئے آدمیوں میں سے ایک شخص کو بھی پکڑے جانے کے بعد خوف و خطر یا انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف کسی حرکت پہ آمادہ نہ کر سکا۔" (مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر)

اس تنظیم کی وسعت کا اندازہ بنگال کے کمشنر پولیس کی اس شہادت سے ہو سکتا ہے:

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسی اسی ہزار ہیں جن میں آپس میں مکمل مساوات ہے۔ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا کام سمجھتا ہے

اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں اسکو کسی کام سے عذر نہیں ہوتا۔ (خطوط نمبر ۱۰۰ مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۴۳ء و نمبر ۱۸۴۵ء ۱۸۴۷ء)

مسلمانان ہندوستان میں اس جماعت نے جو عام جذبۂ جہاد پیدا کردیا تھا اس کا اندازہ ڈاکٹر ہنٹر کی اس روایت سے ہوسکتا ہے :۔

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اسکے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لیے علیحدہ کرکے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کے لیے ستھانہ جاکر خدمت کرتے رہتے۔ جسطرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شرادھ کے لیے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہکر چند ماہ کی رخصت لے لیتے تھے کہ انہیں فریضۂ جہاد کے ادا کرنے کے لیے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔" (سرحدی جنگوں اور حکومت برطانیہ سے مقابلہ کی تفصیلات معلوم کرنیکے لیے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب مسلمانان ہند، یا راقم السطور کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا چوتھا باب پڑھنا چاہیے)

قدیم و جدید طبقہ ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس وقت کی باتیں ہیں جب ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا۔ اور وہ علماء اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ جدید تعلیم کی اس وقت تک دعوت نہیں دی گئی تھی اور اسکے نتائج ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم قائم ہوا جو بعد میں کالج پھر یونیورسٹی بنا۔ اس وقت سے ہندوستان میں قدیم و جدید تعلیم کا فرق نمایاں ہوا۔ علماء نے اس وقت تک حکومت سے مکمل ترک موالات کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں خود شریک ہوئے تھے اور دست بدست جنگ کی تھی۔ بدنام اور شوریدہ سر وہابیوں کے علاوہ

مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی جو دہلی میں رزیڈنٹ کے میر منشی تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اس جہاد میں عملی شرکت کی تھی - حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑی - دوسرے حضرات کو سخت مشکلات پیش آئیں - ہنگامہ فرو ہو جانیکے بعد مولانا فضل حق صاحب اور مولوی عنایت احمد صاحب کاکوروی وغیرہ کو بجرم بغاوت و شرکت ہنگامہ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی -

۱۸۶۳ء و ۱۸۶۴ء میں مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری، مولانا احمد اللہ صاحب عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب وغیرہ پر حکومت ہند کے خلاف سازش کرنے اور مجاہدین سرحد کی خفیہ امداد کرنے کے جرم میں انبالہ کا مشہور مقدمۂ سازش چلایا گیا - انکی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ان کو اول پھانسی پھر حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی - صادق پور (پٹنہ) کے مکانات مسکونہ اور ملزمین کی عمارتیں جوشِ انتقام میں کھود کر پھینک دی گئیں اور انکی جگہ میونسپلٹی کی عمارتیں بنائی گئیں - ۱۸۵۷ء کے بعد سے ایک مدت تک ذرا ذرا سے شبہ پر علماء کو پھانسی، قید اور جلا وطنی کی سزائیں دی جاتی رہیں - علماء کا یہ زخم ابھی بھرا نہیں تھا اور ان مظالم کی یاد ابھی انکے حافظہ سے محو نہیں ہوئی تھی -

اسکے برخلاف علی گڑھ کے تعلیمی و سیاسی مرکز نے مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت اور اہلِ حکومت کے ساتھ تعاون و موالات کی پر جوش دعوت دی - انگریزی تہذیب و معاشرت، شعائر اور نظام تعلیم کے قبول کرنیکی زبردست تبلیغ کی - اور حکومت نے بھی دل کھول کر اس کی امداد اور سرپرستی فرمائی - اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں اور انگریزوں کے اتحاد اور اختلاط و اجتماع کی علی گڑھ میں پہلی مرتبہ داغ بیل پڑی - پھر جب ۱۸۸۳ء میں بظاہر کالج کی پرنسپلی اور درحقیقت

مسلمانوں کی زمام قیادت مسٹر تھیوڈور بیک نے لی تو علی گڑھ کالج ہندوستان میں شملہ و کلکتہ کے بعد برطانوی سیاست کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں مسلمان نوجوانوں کو ذہنی غلامی، خوف و بزدلی، خوشامد و چاپلوسی، پست ہمتی و ملازمت پرستی، نقالی و نمائش اور "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اس بیں کبھی فوج میں اضافہ کرنے کی تجویز پاس کی جاتی تھی، کبھی سرحد پر پیش قدمی اور حملہ کو جائز بتایا جاتا تھا، اور کبھی ان نوجوان مسلمانوں کے ذریعہ سے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر حکومت کے محضر وفاداری پر مسلمانوں سے دستخط لیے جاتے تھے۔ اس شاطر پرفن کا جادو صرف نوجوانوں ہی پر نہیں بلکہ اُس "پیرِ دانا" پر بھی چل گیا جس نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور جس نے "اسباب بغاوت ہند" جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی تھی۔ اور یہ جادو بھی ایسا چلا کہ اس نے مسلمانوں کی باگ ڈور پورے طور پر اس انگریز مدبر کے ہاتھ میں دیدی۔ (ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل)

مسٹر بیک کے بعد سر تھیوڈور ماریسن اور مسٹر آرچبولڈ مسلمانوں کی سیاست پر مسلط رہے۔ فرنگی شیشہ سازوں کے ہاتھوں سے قوم کا جو طبقہ تیار ہوا اسکی ذہنیت، عقیدہ اور ہمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دونوں گروہوں کے متضاد رجحانات کا اگر نمونہ دیکھنا ہو تو سرسید کی وہ مشہور تقریر جو انہوں نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں کی، علماء کے اُس فتوے کیساتھ پڑھنی چاہیے جو مولوی عبدالقادر صاحب لدھیانوی نے کانگریس میں شرکت کے جواز میں شائع کیا تھا اور جس پر تقریباً اس وقت کے تمام نامور و معتبر علماء کے دستخط تھے جن میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

خود علی گڑھ کی جماعت میں بھی اِس وفادارانہ سیاست کے خلاف جس شخص نے سب سے

پہلے آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو آزاد سیاست کی طرف دعوت دی وہ طبقۂ علماء کا ہی ایک ممتاز فرد تھا، یعنی مولانا شبلی نعمانی۔ یہ وہی تھے جنہوں نے مسلم گزٹ میں پر مغز، مدلل اور پرجوش مضامین لکھ کر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سیاسی آزاد خیالی کی روح پھونک دی۔ اسکے بعد مسلمانوں کی عام سیاسی بیداری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلیؒ، مولانا ابوالکلام صاحب آزاد، مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا جو حصہ ہے وہ تمام جدید سیاسی اختلافات کے باوجود واجب التسلیم ہے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے بھی جن اصحاب نے آزادانہ سیاسی پالیسی اختیار کی، ابتداءً وہ علماء ہی کے اکسائے ہوئے تھے۔

۱۹۱۲ء سے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے سلسلہ میں جو کام بھی کیا گیا۔ اس میں علماء وغیر علماء دوش بدوش رہے ہیں اور بعد کی تحریکوں کا امتیاز یہ رہا کہ ان پر مذہبی رنگ غالب تھا۔

قبل اسکے کہ ہم اس باب کو ختم کریں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے متعلق ہم کو ڈاکٹر ہنٹر کی یہ رائے بھی پڑھ لینی چاہیے :۔

"ایک باقاعدہ گورنمنٹ کے ساتھ ہمیشہ دنیا دار لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو۔ اسکے علاوہ ہمیں آرام طلب جماعتوں، ضعیف الایمان لوگوں اور کچھ جائداد والوں کی امداد حاصل ہے جو آن بان کے ساتھ مسجدوں میں جاتے ہیں مگر اصلی معاملات کے متعلق بہت کم سوچتے ہیں۔"

ہندوستان و ٹرکی کے علماء کا فرق (مسلمانان ہند) گذشتہ بیان سے واضح ہو گیا کہ ہندوستان میں علماء کا گروہ بمقابلہ دوسرے ممالک کے، اس ملک کا ترقی پسند، آزاد اور بیدار عنصر رہا ہے۔ وہ سیاسی بیداری اور مذہبی قربانی و سرفروشی میں، ملک کی کسی سیاسی و غیر سیاسی جماعت سے ایک قدم پیچھے نہیں

رہا - بلکہ ترکی کے برخلاف ہندوستان میں سیاسی بیداری کے دور کا آغاز بھی مذہبی طبقہ اور علمار سے ہوا ہے - پس مسلمانوں کے کسی طبقہ کو جو ترکی کے انقلابی طبقہ کا ہندوستان میں قائم مقام ہو سکتا ہے (اور مسلمانوں میں ایسا کوئی طبقہ اس وقت تک موجود نہیں) علمار سے وہ شکایت اور بنائے مخالفت نہیں ہو سکتی جو انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوانوں یا موجودہ جمہوریت ترکیہ کے بانیوں کو اپنے علمار سے تھی - اگر یہاں کبھی مذہب و سیاست میں تفریق کی گئی تو اسکے اسباب و محرکات وہ نہیں ہونگے جو ترکی میں تھے -

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں علمار کے خلاف رجحان موجود ہے اور وہ تقریر و تحریر میں ظاہر ہوتا ہے - موجودہ اسلامی سیاست کے ایک مشہور قائد نے بارہا اپنے اس کارنامہ پر فخر کیا ہے کہ انکی جماعت نے علمار کو سیاست سے نکال دیا ہے - لکھنؤ کے ایک روزنامہ نے اس موضوع پر مسلسل افتتاحیے لکھے ہیں کہ علمار کو سیاست سے خارج کر دینا چاہیے - مقالات و رسائل کا کوئی حد و شمار نہیں علمار سے صاف صاف مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ حسب معمول قدیم درس و تبلیغ کا کام سنبھالیں اور اس میدان کو اس کے شہ سواروں کے لیے چھوڑ دیں - ایک عالم نے خوب فرمایا کہ جب علماء سیاست میں شریک نہیں تھے تو ان پر حجرہ نشینی اور دنیا سے بے خبری کا سب سے بڑا الزام تھا اور انکو سیاست میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی - جب وہ میدان میں آئے اور انہوں نے اپنے ایثار اور قربانی سے اپنی جگہ پیدا کر لی تو ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ واپس جائیں اور انہیں حجروں میں معتکف ہو جائیں "

ہم کو علم ہے کہ اس جدید طبقہ میں کثرت سے مخلص اور صاحب حمیت مسلمان ہیں اور ان میں سے بہت سے اسلامی حقائق کو شائد بہت سے علمار سے اچھا سمجھتے ہیں - ہم ان سے کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب و سیاست کا یہ انفصال الحاد کا پیش خیمہ اور وہ "مسیحی فتنہ" ہے جس نے

یورپ کی جمہوریت کو چنگیزی بنا دیا ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علماء کی خدمت میں | اب ہم کو علماء کی خدمت میں بھی یہ عرض کرنا ہے کہ آپکے فرائض اس عہد انقلاب میں اتنے بڑھ گئے ہیں جتنے شائد ہی تاریخ اسلام کے کسی عہد میں رہے ہوں۔ شریعت، ثقافت، مدنیت اور اسلامی زاویۂ نظر کی حفاظت اور وہ تمام فرائض جو کسی اسلامی سلطنت سے کسی زمانے میں ہو سکتے تھے، اب خالصتہً آپ کے فرائض ہیں۔ آپ ان تمام غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچیے جو قرون متوسطہ کے مذہبی طبقہ اور انیسویں بیسویں صدی کے ترکی علماء سے ہوئیں، جنکی تفصیل گذشتہ اوراق میں گذر چکی ہے۔ ورنہ نوجوانوں کے الحاد، لاکھوں مسلمانوں کے سوء خاتمہ اور ساری قومی زندگی کی غیر مذہبیت کا گناہ آپکے سر ہوگا، جس کا کوئی عبادت، کوئی علمی، تدریسی، تصنیفی خدمت کفارہ نہیں کر سکیگی، اور تاریخ اسلام سے آپکا یہ گناہ کبھی محو نہ ہوگا۔ میں آپ کو "تو با زمانہ بساز" کی تعلیم نہیں دیتا، میں تو اس فلسفہ کا قائل ہوں:

حدیثِ کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

لیکن اس "با زمانہ ستیز" کے لیے آپ کو نئے ہتھیاروں سے مسلح ہونا پڑے گا، اور جدید فنون و طریقۂ جنگ سے آگاہی پیدا کرنی ہوگی۔ طریق و اسلحۂ جنگ کے اختلاف و تنوع سے آپکے مقصدِ جنگ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آپکا مقصد ایک ہی ہونا چاہیے اور وہ اسلامی شریعت، اسلام کے وقار، اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور اسلام کا نظام حکومت و نظام تمدن قائم کرنا ہے۔ آج الحاد، فلسفہ و اعتزال اور علم کلام کے مسائل کی راہ سے نہیں آتا۔ عقلیت اور سائنس کی راہ سے اگر آتا ہے تو بہت کم آتا ہے۔ آج کا الحاد، سیاست کی راہ سے اور جدید سیاسی، اقتصادی

اور تمدنی نظریوں اور تحریکوں کی راہ سے آرہا ہے اور بڑی سرعت و قوت کے ساتھ آرہا ہے۔

سب سے بہتر اور موثر طریقہ پر اسکو بحث و جدل سے نہیں بلکہ عمل اور سیاسی اقتدار سے روکا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس بے عملی کے زمانہ میں بھی سب سے بڑی دلیل و برہان عمل، اور عقلیت کے اس دور میں بھی سب سے بڑی منطق اقتدار کی منطق ہے۔ آپ سیاست میں ضرور شریک ہوں، لیکن اس ہنگامہ میں اپنا مقصد نہ بھولنے پائیں، اور آپکی حیثیت ایک منٹ کے لیے بھی کسی جماعت کے آلۂ صوت یا آلۂ کار کی نہ ہونے پائے، اور آپکو کوئی سیاسی جماعت اپنے مقصد سے غافل نہ کرنے پائے نہ اپنے مقصد کے لیے فریب دینے پائے۔ اس وقت عالم انسانیت ہمیشہ سے بڑھ کر اس کا محتاج ہے، اور سب مالوں سے بڑھ کر اس زمانہ میں یہ فرض اہم ترین ہے کہ دنیا میں اسلام کا نظام حکومت اور نظام حیات قائم کیا جائے ظاہر ہے کہ یہ مقصد صرف آپکا ہو سکتا ہے اور یہ کام صرف آپ ہی سے انجام پا سکتا ہے۔ اگر آپنے اپنی زندگی اور اپنی سعی و جہد کا کوئی دوسرا مقصد قرار دے لیا تو یقین جانیے اللہ تعالیٰ یہ منصب آپ سے لیکر کسی دوسری جماعت کو سپرد فرما دیگا اور اسکو اسکی اہلیت و توفیق عطا فرمائیگا۔ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔

مطبوعات

مجدد الف ثانی کا تصور توحید تالیف ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (بزبان انگریزی)۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب۔ کشمیری بازار، لاہور۔

مسلمانوں میں وحدت وجود کا خیال ابن عربی اور شہاب مقتول (صاحب حکمتہ الاشراق) کی بدولت مقبولِ عام ہوا اور رفتہ رفتہ تصوف، اخلاق، فلسفہ، ادب، شعر، سب پر حاوی ہوگیا، یہاں تک کہ دین و شریعت کے علم و عمل کو بھی اس نے بہت کچھ ماؤف کیا۔ آخر کار اس وبائے عام کے خلاف جہاد کرنے کے لیے دو مردِ خدا اٹھے جنکی کوششوں سے بڑی حد تک اس کا زور ٹوٹا۔ ایک ابنِ تیمیہ، دوسرے شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ۔ لیکن ابن تیمیہ کا جہاد فی الواقع اتنا کارگر ثابت نہ ہوا جتنا شیخ مجدد کا جہاد۔ کیونکہ ابنِ تیمیہ کا حملہ خالص علوم شریعت اور استدلال کے ہتھیاروں سے تھا جن سے بچنے کے لیے ارباب تصوف کے پاس یہ حیلہ موجود تھا کہ تم اس کوچہ کے آدمی ہی نہیں ہو۔ بخلاف اسکے شیخ مجدد خود اس کوچہ ہی کے آدمی تھے، اور معمولی آدمی نہیں بلکہ شہسوار تھے۔ انہوں نے خود تصوف ہی کے ہتھیاروں سے اس عقیدہ کی خبر لی اور ایسی خبر لی کہ تسمہ تک لگا نہ چھوڑا۔ ارباب تصوف کہتے تھے کہ ہم کشف و شہود کی باطنی حس سے حقیقت کا مشاہدہ کرنے گئے اور ہم نے یہ پایا کہ خالق و مخلوق، عبد و معبود، دو جداگانہ وجود نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہیں، یعنی خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔ شیخ مجدد نے جواب میں پورے زور کے ساتھ کہا کہ میں خود یہی باطنی حس لے کر مشاہدہ کرنے گیا تھا، اور جہاں تک تم پہنچے اس سے آگے پہنچ کر میں نے یہ پایا کہ حقیقت براہِ راست ہمارے علم و ادراک کے احاطہ میں نہیں آسکتی، ہمارے لیے اسکے سوا چارہ نہیں کہ نبی کے اعتماد پر بس ایمان

بالغیب لے آئیں، اس کو معلوم کرنے کی کوشش سرے سے غلط ہے، دراصل وہ معلوم کرنے کی چیز ہی نہیں ہے، صرف ایمان لانے کی چیز ہے۔ تم جن مقامات سے گذرے وہ سلوک کی ادنیٰ منزلیں ہیں۔ وہاں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہے اور اس ایک کے سوا کچھ موجود نہیں، مگر یہ صرف وحدت شہود ہے (یعنی ایسا نظر آتا ہے) وحدتِ وجود نہیں ہے (یعنی فی الواقع ایسا نہیں ہے)۔ ان بیچ کی منزلوں میں جو واردات سالک پر گذرتے ہیں، ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے، اسلیے کہ اس راہ کا بے خطا اور بے امکانِ خطا علم اگر کسی کو ملا ہے تو وہ صرف صاحبِ وحی کو ملا ہے۔ پس صاحبِ وحی کا علم اصلی معیار ہے اور سالک کے لیے لازم ہے کہ منازلِ سلوک میں سے ہر منزل پر جو کچھ اُسے محسوس ہو اُسکو اس معیار پر جانچ کر دیکھے، اسکے مطابق ہو تو سمجھے کہ صحیح ہے اور اس سے مختلف ہو تو نظر کا دھوکا سمجھ کر رد کر دے۔ ورنہ اگر علم وحی کے اتباع سے آزاد ہو کر خود اپنے مشاہدے پر اعتماد کرے گا تو غلطی کرے گا، اور اگر اپنے مشاہدات کی روشنی میں وحی کی تاویل کرے گا تو اس سے بھی عظیم تر غلطی کرے گا ــــ شیخ مجددؒ نے اس خیال کا صرف اظہار ہی نہیں کیا بلکہ وحدت الوجود کے خلاف پیہم تبلیغ کر کے اسکے اثرات کو مٹانے کی زبردست کوشش کی اور اُن کا یہ کارنامہ اُن بڑے کارناموں میں سے ایک ہے جن کی بدولت انہیں مجدد الف ثانی کا لقب دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر برہان احمد صاحب نے اس کتاب میں شیخ کے اسی کارنامہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے ابتدا میں مجدد صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کر کے انکی شخصیت سے ناظرین کا تعارف کرایا ہے۔ پھر پوری تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ فلسفیانہ (یا خیالی و نظری) توحید اور مذہبی توحید کے مبدأ، غایت، مقتضیات، لوازم، اور نوعیت میں بنیادی فرق کیا ہے اور نہایت تشفی بخش دلائل سے ثابت کیا ہے کہ صوفیۂ وجودیہ کی اصلی غلطی جسکی وجہ سے وہ صراط مستقیم سے ہٹ گئے یہ تھی کہ انہوں نے فلسفیانہ توحید اور مذہبی توحید کے اصولی فرق کو نظر انداز کر کے دونوں کو عجیب طرح خلط ملط کر دیا۔ یہ بحث دراصل اس

کتاب کی جان ہے اور اس سے جس خوبی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ مستحق داد ہے
اسکے بعد انہوں نے ابن عربی کی نیم فلسفیانہ و نیم مذہبی توحید کی تشریح کی ہے اور پھر مجدد صاحب کے ان دلائل
کو پیش کیا ہے جن سے وہ ابن عربی کی تردید اور اپنے تصورِ توحید کا اثبات کرتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے
ان بحثوں کا خلاصہ دیا ہے جو مجدد صاحب کے بعد ایک مدت تک ہندوستان میں ابن عربی کے حامیوں
اور مجدد صاحب کے پیروؤں کے درمیان برپا رہیں اور انکے درمیان محاکمہ کرکے ثابت کیا ہے کہ اسلام
کی اصلی توحید وہی ہے جسے شیخ مجدد نے فلسفیانہ تصوف کے ظلمات سے نکال کر از سرِ نو نمایاں کیا۔ ڈاکٹر
صاحب کے اس مقالہ پر علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے اور حق یہ ہے کہ ان کا
یہ کام اِس اعتراف کا پورا مستحق تھا۔

انسانی کام کوتاہیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی چند کوتاہیاں ہیں۔

صفحہ ۵۰ سے ۵۲ تک ڈاکٹر صاحب نے مذہبی شعور کے مبدا کی جو تشریح کی ہے اسکو پڑھتے ہوئے
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا مذہب میں خدا اور اسکی صفات کا جو تصور ہے وہ اُس طلب سے پیدا ہوا ہے
جو مشکلات اور مزاحمتوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے آپ کو ضعیف و بے چارہ پاکر ایک خدا، اور
ایسے ایک خدا کے لیے انسان کے اندر فطری طور پر ابھرتی ہے۔ حالانکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان
کے اندر صرف طلب ہی طلب ہے، مطلوب کا کوئی صحیح اور متعین تصور مجرد اس طلب سے پیدا نہیں ہوتا۔ مطلوب
کون ہے اور کیسا ہے ("ہونا چاہیے" نہیں بلکہ "ہے") یہ بات خود مطلوب کی طرف سے آئے ہوئے
نبی بتاتے ہیں اور انسان کی اِسی اندرونی طلب سے اپیل کرتے ہیں کہ جسے تو ڈھونڈ رہی تھی وہ یہ ہے
اگر نبی کے بغیر انسان خود اپنی اندرونی طلب کے اشاروں سے اُس کا سراغ لگائے تو کبھی اسکی ذات
و صفات کے متعلق ایسے صحیح اور مکمل تصور تک نہیں پہنچ سکتا، اور واقعہ یہ ہے کہ کبھی نہیں پہنچ سکا،
کیونکہ اندرونی طلب کے اشارے بہت خفی ہیں، استدلال کے پاؤں کمزور ہیں، اور ہوائے نفس کا رہزن

ہر وقت راہ مارنے کے لیے مستعد ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا مافی الضمیر وہ نہیں ہے جیسا اِس مقام پر انکی بحث سے ظاہر ہوتا ہے، مگر انکے بیان کا انداز ایسا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ بہتر ہو کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ایک نوٹ لکھ کر اس غلط فہمی کا سدباب کر دیں۔

صفحہ ۹ اور صفحہ ۷۱ کے حاشیوں میں انہوں نے چند اصطلاحات کی تشریح میں غلطی کی ہے۔ اجماع کو انہوں نے اسلام کا تیسرا ماخذ بتایا ہے۔ حالانکہ اول تو اجماع دراصل اسلام کا نہیں بلکہ احکام شریعت کا ایک ماخذ ہے، اور پھر وہ مستقل بالذات ماخذ نہیں بلکہ تابع کتاب و سنت ہے۔ چونکہ تمام مسلمان مل کر بھی شارع نہیں بن سکتے، اسلیے مسلمانوں کا مجرد کسی امر پر اتفاق اُس کو شریعت نہیں بنا دیتا، بلکہ شریعت میں حجت صرف وہ اجماع ہے جسکی اصل کتاب و سنت میں پائی جاتی ہو۔ تقلید کی تعریف میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "کسی خاص امام کے اجماع اور قیاس کو بجائے قرآن و حدیث کے ماخذِ اسلام ماننا تقلید ہے"، یہ صریحاً غلط ہے۔ تقلید کی صحیح تعریف "کسی امام کے اجتہاد و استنباط پر اعتماد کرنا اور خود براہِ راست کتاب و سنت سے احکام اخذ نہ کرنا" ہے۔ غیر مقلد کی تعریف ڈاکٹر صاحب نے یہ کی ہے کہ غیر مقلد وہ ہے جو اجماع اور قیاس کو ماخذ اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴ کے حاشیہ میں "در اطیعوا الرسول خجالتہا دارم" کا ترجمہ مصنف نے یہ کیا ہے کہ "میں اطیعوا الرسول سے غفلت کرنے پر شرمسار ہوں"۔ حالانکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ "مجھے اطیعوا الرسول ہی میں شرمندگیاں لاحق ہوتی ہیں"۔

صفحہ ۲۸ پر ڈاکٹر صاحب نے "اسلامی بادشاہی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ایسی ہی متضاد ترکیب ہے جیسے "سفید سیاہی"۔ اسلام تو صرف ایک بادشاہ کو جانتا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ کسی دوسرے کی بادشاہی اسے تسلیم ہی نہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

قسمت رجال بالملوك سفاهة ولا ملك الا للذی خلق الملکا

یعنی آدمیوں نے کم ظرفی و نادانی سے اپنے آپ کو بادشاہ کہا حالانکہ دراصل بادشاہی اسی کی ہے جس نے ملک کو پیدا کیا۔

صفحہ ۲۹ پر ڈاکٹر صاحب نے نبوت کو انگریزی لفظ "پرافسی" کا ہم معنی بتایا ہے۔ حالانکہ دونوں کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ نبوت کے لغوی معنی خبر دینے کے ہیں اور اصطلاحاً نبوت کا مفہوم غیب کی اطلاع دینا ہے۔ بخلاف اسکے پرافسی کا مفہوم آئندہ کی خبر دینا یا پیش گوئی کرنا ہے۔ عیسائی اور یہودی بیچارے اپنے ذہن کی تنگی کے سبب سے پیش گوئی ہی کو بڑا کام سمجھتے تھے اور اس سے بالاتر نبوت کے کسی مفہوم سے آشنا نہ تھے اسلیے انہوں نے کاہنوں کو نبی اور نبیوں کو کاہن سمجھا اور وہی "پرافٹ" کا لفظ انبیاء کے لیے استعمال کیا جو کاہنوں پر صادق آتا تھا۔

صفحہ ۳۴ پر لفظ سنت کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے "عادت" کیا ہے اور اصطلاحی مفہوم "نبی صلعم کے عادی افعال" بتایا ہے۔ حالانکہ سنت کا صحیح ترجمہ "طریقہ" ہے اور اصطلاحاً اس سے مراد نبی صلعم کا وہ طرز زندگی ہے جو اتباع کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

صفحہ ۳۹ و ۴۰ پر ڈاکٹر صاحب نے سرسید اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کے متعلق جو نوٹ لکھے ہیں وہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اول تو ان دونوں حضرات کا ذکر مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کے سلسلہ میں لانا یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ گویا یہ بھی اسی سلسلہ کے آدمی ہیں۔ وشتان ما بین ھٰؤلاء و ھٰؤلاء۔ پھر سرسید کے کام کو "اصلاح" اور "تنقید عالی" کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ "مسلمانوں میں انکے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی و تعلیمی تحریکیں اٹھیں ان سب کا سر رشتہ کسی نہ کسی طرح اُن سے ملتا ہے"، دراصل مبالغہ کی حد سے بھی بہت متجاوز ہے۔ علی گڑھ کے تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو خواہ سرسید سے کتنی ہی ارادت ہو، مگر جب وہ ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے سامنے آرہے ہیں تو انہیں بے لاگ حق کا اظہار کرنا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ

ــشہ کے بعد سے ابتک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہیں اُن سب کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسید کی ذات تک پہنچتا ہے - وہ اس سرزمین میں تجدّد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ رہے مولوی عبداللہ چکڑالوی تو ان کو "قرآن کا بڑا عالم" کہنا قرآن پر ظلم ہے - ایک بہکا ہوا آدمی جسکے ذہن کا توازن بگڑا ہوا ہو علم قرآن کی دولت سے کچھ بھی بہرہ نہیں پا سکتا -

صفحہ ۸۰ پر مصنف نے صاحب حکمۃ الاشراق کا نام شیخ شہاب الدین سہروردی لکھا ہے - اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شائد یہ وہی طریقۂ سہروردیہ کے بانی ہیں - حالانکہ وہ شہاب الدین سہروردی اور ہیں - اس التباس کو دور کر دینا مناسب ہے -

صفحہ ۱۳۵ پر مصنف نے قل الروح من امر ربی کا مطلب، عام غلط فہمی کے اتباع میں "روح امر رب ہے" بتایا ہے - حالانکہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ روح خود امر رب ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ "روح امر رب سے ہے"۔ لفظ مِن کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے -

افسوس ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں ہے - فلسفیانہ تصوف کے مارے ہوئے لوگ تو اصل میں اردو خواں ہیں - ان مارگزیدوں کو انگریزی تریاق کیا کام دیگا - ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں شائع کیا جائے -

اسلام کا اقتصادی نظام | تالیف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی - ضخامت ۲۲۸ صفحات - قیمت عـ/ ندوۃ المصنفین قرول باغ - دہلی -

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کتاب میں اسلام کے معاشی احکام و قوانین کو ایک نظام کی شکل میں مدوّن کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ یہ نظام کس طرح دنیا کے موجودہ معاشی مسائل کا ایک صحیح و متوازن حل پیش کرتا ہے اور کن وجوہ سے یہ دوسرے نظامات معیشت کے مقابلہ میں لائق ترجیح ہے - انکی یہ کوشش اس لحاظ سے ضرور قابل قدر ہے کہ

انہوں نے معاشی معاملات کے متعلق قرآن، حدیث اور فقہی کتابوں میں سے کافی مواد جمع کر دیا ہے جو بجائے خود نہایت مفید ہے، لیکن اپنی تصنیف کا جو مقصد انہوں نے بیان کیا ہے اُسکے لحاظ سے ہم اسکو ایک ناکام کوشش کہنے پر مجبور ہیں۔ علم المعیشت سے انکی فنی واقفیت محض سرسری نوعیت کی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے فراہم کردہ مواد کو سائنٹفک طریقہ پر مرتب کرنیکے بجائے عجیب طریقہ سے بکھیر دیا ہے جس سے اسلامی نظام معیشت کا کوئی واضح نقشہ ذھن میں نہیں بنتا۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ اشتراکیوں کو راضی کرنے کی ایک تبلیغی کوشش ہے۔ پھر جہاں انہوں نے دوسرے معاشی نظاموں سے اسلامی نظام کا تقابل کیا ہے وہاں تو انکی ناواقفیت بُری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ فاشزم اور مارکسزم دونوں کے متعلق انکی معلومات نہایت ناقص بلکہ غلط ہیں۔ اور اسی ناقص علم کی وجہ سے انہوں نے بے تکلف یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ فاشزم کی بہ نسبت مارکسزم اسلام سے اقرب ہے، حالانکہ دونوں اسلام سے یکساں دور ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے جسقدر لعنت کے قابل فاشزم ہے اسی قدر مارکسزم بھی ہے۔

کتاب کا سب سے زیادہ افسوسناک حصہ وہ ہے جہاں ہندوستان کے موجودہ حالات پر مصنف نے اپنے نظریات کو منطبق کرنیکی کوشش کی ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے تو وہ حاضر الوقت معاشی نظام میں انقلاب کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں کہ یہ انقلاب دو نظریوں میں سے کسی ایک نظریہ ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ ایک خالص اسلامی نظریہ، دوسرا وہ نظریہ جو اسلامی نظریہ کے اصولوں سے قریب تر ہو (یعنی اشتراکی نظریہ)۔ اور آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"بلا خوف لومۃ لائم اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس ملک میں سردست پہلا نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا بلکہ دوسرا نظریہ ہی ممکن الوقوع ہے"

۲۳۲ صفحہ کی بحث کے بعد یہ نتیجہ جس پر ہر لائم کی ملامت سے بے خوف ہو کر جناب مولانا پہنچے ہیں، انکی اس تمام محنت پر پانی پھیر دیتا ہے جو انہوں نے اسلامی نظام معیشت کی خوبیاں بیان کرنے میں صرف فرمائی ہے۔ جو چیز "سردست" جامۂ عمل پہن ہی نہیں سکتی، بہتر تھا کہ سردست اُسکی شرح و تفسیر میں بھی وقت ضائع نہ کیا جاتا۔ پھر وہ اشتراکیت جسکو وہ اپنی عجیب و غریب "اسلامی بصیرت" کی بنا پر اسلامی نظریہ سے قریب تر سمجھ رہے ہیں، اچند ظاہری

پہلوؤں میں اسلام سے کچھ قریب ہو تو ہو، مگر اسکی فلسفیانہ بنیاد، اسکی اخلاقی روح، اسکا نظریۂ حیات، اور اس کا تجویز کردہ نظام اجتماعی تو اسلام سے اتنا ہی دور ہے جتنا موجودہ سرمایہ داری نظام۔ اُسکو اسلام سے قریب وہی سمجھ سکتا ہے جو اُسکو نہ جانتا ہو یا سرے سے اسلامی بصیرت ہی نہ رکھتا ہو۔ اس کافرانہ نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے لیے جناب مولانا نے چند مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی تحفظات تجویز کیے ہیں، حالانکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کے تحفظات کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں ہے، اور ایسے تحفظات کی فکر صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنکی کم ہمتی پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ ہمیں بہر حال رہنا دوسروں ہی کی عمارت میں ہے، اپنی عمارت کبھی نہیں بنانی۔ صاف اور سیدھی بات جس کو خوشنما الفاظ کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے، دراصل یہ ہے کہ علمائے کرام کے جس گروہ سے مولانا کا تعلق ہے اُس پر نا اہلی کے ساتھ کم ہمتی اور شکست خوردگی کا تسلط ہو گیا ہے۔ اِن لوگوں میں خود اپنے بل بوتے پر کوئی اسلامی تحریک اٹھانے کی ہمت اور صلاحیت نہیں ہے، اس لیے کبھی اشتراکیوں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے ہمسایہ کی پامردی سے بہشت میں پہنچنا چاہتے ہیں۔ لیکن اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے لوگوں کو یقین یہ دلاتے ہیں کہ قصور ہمارا نہیں ہے، یہ اسلامی نظریہ ہی کم بخت ایسا ہے کہ "سر دست" اِس کا جامۂ عمل پہننا محال ہے۔ سوال یہ ہے کہ "سر دست" اشتراکی نظریہ کا جامۂ عمل پہننا کیوں ممکن الوقوع ہو گیا ہے؟ کیا اِسکی کوئی وجہ آپ اِسکے سوا بتا سکتے ہیں کہ اس نظریہ کے حامی آپ سے زیادہ لائق اور آپ سے زیادہ باہمت ہیں؟ وہ انقلاب برپا کرنیکا فن جانتے ہیں اور آپ نہیں جانتے۔ اُن میں یہ جرأت ہے کہ جہاں سرمایہ داری نظام پوری طاقت کے ساتھ مسلط ہے وہاں کھڑے ہو کر اپنے نظریہ کے مطابق انقلابی جدوجہد شروع کر دیں، اور آپ میں یہ جرأت نہیں ہے۔ اگر اس کے سوا اشتراکی انقلاب کے ممکن الوقوع ہونے کا کوئی اور سبب ہے تو ہم چیلنج کرتے ہیں کہ اسکو بیان کیا جائے۔ لیکن اگر اصل وجہ یہی ہے تو پھر "سر دست" کی آڑ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف اقرار کیجیے کہ اسلامی نظریہ کا جامۂ عمل پہننا کسی وقت بھی ممکن نہیں، کیونکہ جس نظریہ کے پیرو محض نظری حیثیت سے اُس پر ایمان رکھتے ہوں، مگر نہ کارداں ہوں نہ صاحبِ عزم، وہ نظریہ کبھی قیامت تک دنیا میں جامۂ عمل نہیں پہن سکتا۔

اپنی کمزوری کو چھپانا تو خیر اخلاقی کمزوری کی تعریف میں آتا ہے، مگر جب انسان باطل کو حق اور حق کو باطل

ثابت کرنے کی کوشش پر اُتر آئے تو یہ چیز کمزوری سے بڑھ کر جرم کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"میرے پاس اس یقین کے لیے روز روشن کی طرح دلائل و شواہد موجود ہیں کہ آج سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والی طاقت اس طرزِ عمل سے بہت خوش ہے بلکہ اس کی متمنی ہے کہ اسلام کے مقدس نام پر پہلے نظریہ کو آج کے ماحول میں زیادہ سے زیادہ معرض تحریر و تقریر میں لایا جائے اور قول و گفتار کا کوئی گوشہ اس میں نہ چھوڑا جائے، کیونکہ اس کو یہ یقین ہے کہ یہ کلمۃ حق ارید بہ الباطل کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو اس کے جابرانہ نظام کے استحکام کے لیے از بس مفید ہے۔ اور اس کے برعکس دوسرے نظریہ کی معمولی سی حرکتِ انقلاب پر زیادہ سے زیادہ تشدد پر آمادہ ہو جاتی اور اس کو فنا کرنے اور قائم نہ ہونے دینے کے لیے مختلف اور ظالمانہ انداز کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے، اسلیے کہ وہ خوب واقف ہے کہ اُس کے نظام کی تباہی کا عملی راستہ بحالت موجودہ یہی اور صرف یہی ہے۔"

اس عبارت کا ایک ایک لفظ عبرتناک ہے۔ استدلال کی صورت یہ ہے کہ اسلامی نظریہ کا اعلان و اظہار انگریز کو پسند ہے اور اس کے اقتدار کی جڑ مضبوط کرتا ہے، اور اشتراکی نظریہ ایک کارگر انقلابی طاقت حاصل کر چکا ہے اور انگریز اُس سے ڈرتا ہے، لہٰذا جو اسلامی نظریہ کے لیے کام کرے وہ برسرِ باطل اور جو اشتراکی نظریہ کی حمایت کرے وہ برسرِ حق! نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر اسی کا نام دیانت ہے تو ایسی دیانت کو دور سے سلام۔ اِن لوگوں نے انگریز کی دشمنی کو ایک مستقل دین بنا لیا ہے اور اسی دین کے معیار پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اول تو یہ خود عصبیتِ جاہلیہ ہے۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے اس کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ استدلال ایک مسلمان کے لیے کچھ کم شرمناک نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اشتراکیت ہمارے علماء کی مردانگی و قابلیت سے ایک کارگر طاقت نہیں بنی ہے بلکہ اشتراکی ملاحدہ کی قابلیت و مردانگی سے بنی ہے اور "سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والی طاقت" اُس سے اسی لیے ڈرتی ہے کہ وہ ایک طاقت بن چکی ہے۔ بخلاف اس کے اسلام سے وہ اسی لیے بے خوف ہے کہ اس کو کوئی طاقت اسلام کی پشت پر نظر نہیں آتی حتی کہ وہ موجودہ حالات میں اسلام کا نام لینے والوں کی پیٹھ بھی ٹھونکنے سے دریغ نہیں کرتی، کیونکہ وہ دیکھ رہی ہے کہ اِس دین کے پیرو یا تو منافق ہیں یا نالائق اور پست ہمت۔ ورنہ اگر اس کی پشت پر حقیقت میں کوئی کارگر طاقت ہوتی تو شاید آج کوئی سرمایہ

دارانہ نظام رکھنے والی طاقت" اُس سے بہت کیا، ذرہ برابر بھی خوش نہ ہوتی، بلکہ "اس کی معمولی سی حرکت انقلاب پر زیادہ سے زیادہ تشدد پر اتر آتی"۔ پس دراصل یہ صورت حال جسکو مولانا صاحب نے دلیل میں پیش فرمایا ہے، اُنکے طرزِ عمل کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اُن کے لیے اور ہر مسلمان کے لیے شرم سے ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اللہ اللہ! اسلام ہمارے اور انکے جینے جی اس حد کو پہنچ گیا کہ اب شیطان اُس سے خوش ہونے لگا!

کانفڈریسی آف انڈیا مصنفہ "ایک پنجابی"۔ شائع کردہ سر محمد شاہ نواز خان نواب ممدوٹ، ڈیوس روڈ، لاہور

یہ کتاب پاکستانی تحریک کے لٹریچر میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس مسئلہ کا علمی اور تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں پاکستان کے بجائے "انڈستان" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ پاکستان کے دوسرے نظریات میں اور اس تجویز میں کوئی بنیادی اور اصولی امتیاز نہیں۔ کتاب کا آدھا حصہ اس بحث میں صرف کیا گیا ہے کہ شمالی مغربی ہند کو باقی ہندوستان سے الگ کر کے یہاں ایک خود مختار اسٹیٹ قائم کرنا کس لیے جائز اور واجب ہے۔ اس سلسلہ میں بعض واقعات و حقائق کو نہایت صفائی اور خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ہندوستان کی گذشتہ پچاس سالہ تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہاں کی سب سے بڑی اور مقتدر سیاسی جماعت، یعنی آل انڈیا نیشنل کانگریس کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف ناروا بلکہ ناقابل برداشت رہا ہے۔ اس جماعت کا سب سے بڑا منصوبہ اور مقصد یہ رہا ہے اور ہے کہ مسلمانوں کے علحدہ وجود کو فنا کر کے ملک میں ایک متحدہ قومیت کی بنا ڈالی جائے۔ اسی لیے باوجودیکہ کئی بار ہندو مسلم سمجھوتہ ہوا، سیاسی اتحادات قائم ہوئے، مگر بہر حال اکثریت کی قوم نے کبھی ایفائے عہد کی شرم نہ رکھی۔

اس کے بعد مسئلہ قومیت پر ایک تفصیلی بحث کی گئی ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ جب سے مسلمان اس ملک میں آباد ہوئے ہو آج تک مشترکہ قومیت کی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوئی بلکہ بسا اوقات باہمی تصادم اجارانہ جنگی اور خونریزی کا باعث بنی۔ زمانہ حال میں ہندوؤں نے اپنی قومی عصبیت اور اسلام دشمنی کا طرح طرح سے ثبوت دیا ہے۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس، ہندو مہا سبھا، آریہ سماجی تحریک وغیرہ دراصل ایک ہی خواب کی ذرا بدلی ہوئی تعبیریں

ہیں۔ اور یہ خواب کیا ہے؟ یہ خواب ہے ہندوستان میں ہندو قوم کی فرمانروائی۔

اسی سلسلے میں قومیت کے اسلامی اور مغربی تصور کا فرق بتایا گیا ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ اسلامی نظریہ کی اساس کن چیزوں پر ہے۔ اسلام اپنا ایک الگ اور مستقل نظامِ حیات رکھتا ہے اس لیے نہ وہ دوسرے نظامات میں جذب ہو سکتا ہے اور نہ ان کے ساتھ تعاون ہی کر سکتا ہے۔

یہ تمام دلائل پیش کرتے ہوئے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ شمالی مغربی ہند کو بقیہ ہندوستان سے کاٹ کر یہاں ایک آزاد حکومت قائم کی جائے چونکہ اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے یہاں "مسلم راج" ہونا چاہیے۔ اسی طرح بنگال اور بعض قریب کے اضلاع کو ملا کر ایک دوسرا وفاق تیار کیا جائے جہاں ایک اور مسلم اسٹیٹ قائم ہو۔ باقی ملک کو راجستان، ہندوستان، اور دکن، تین منطقوں یا وفاقوں میں بانٹ دیا جائے اور وہاں "ہندو راج" ہو۔ ان پانچوں وفاقوں میں آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ پھر اگر یہ چاہیں تو آزاد رہیں اور ضرورت سمجھیں تو بعض مشترک اغراض کے لیے ایک تحالف (کانفڈریسی) میں شریک ہو جائیں۔

اس امر کے سمجھانے کی کافی وشافی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان ایک علٰحدہ قوم ہیں، اُن کا ایک مخصوص اور متمیز تمدن ہے، ایک الگ تاریخ ہے، وہ ایک خاص عقیدے اور روایات کے حامل ہیں، لہذا اُن کی "قومی" زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اُن کا ایک قومی گھر بھی ہو، اپنا ایک الگ اسٹیٹ بھی ہو۔ حُسنِ اتفاق سے "ہندستان" میں مسلمان پہلے ہی اکثریت میں ہیں اور یہ تاریخی، نسلی، تمدنی، معاشی اور دوسرے اعتبارات سے ہندوستان کی باقی قوموں سے مختلف بھی ہیں۔ پس ان کی طرف سے اپنی ایک علٰحدہ سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ جائز اور فطری ہے اور ان کی ہیئت اجتماعیہ کے بقا کے لیے یہ ضروری ہے۔

ساری کتاب پڑھ جانے کے بعد چند باتیں خاص طور پر دماغ کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں:

(۱) اول یہ کہ مصنف کی نظر میں ہندوستان کے مسلمانوں جیسے نیک اور معصوم لوگ دنیا میں اور کہیں نہیں ملتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور محبوب بندے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہندوؤں نے ان پر مسلسل اور بے پناہ ظلم

ڈھائے ہیں۔ اپنی شماری اکثریت کی بنا پر انگریز کے قائم کردہ نیم جمہوری نظام سے فائدہ اٹھا کر غریب اور بے دست و پا مسلمانوں کو خوب کچلا ہے۔ اور اب اُنکے ساتھ رہنا ناقابل برداشت ہے۔ مصنف نے کہیں بھولے سے بھی یہ نہیں لکھا کہ آخر یہ مسلمان خود اس ملک میں ایک ہزار سال سے کیا کرتے رہے ہیں۔ انکی اخلاقی و معاشرتی زندگی کس سانچے میں ڈھلی۔ انہوں نے اپنی قوتوں کو کن مقاصد زندگی کے پیچھے صرف کیا۔ انکے سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی تنزل میں انکے اپنے کرتوتوں کا کتنا دخل ہے۔ انہوں نے اپنی تہذیب اور روایات کو آخر کیوں نہ محفوظ رکھا۔ انگریز اور ہندو کی سیاست سے کیوں دھوکا کھا گئے۔ اور اگر یہ غلطیاں ہوئیں تو ذمہ دار کون ٹھیرا؟ قابل مصنف نے دور دور کی باتیں تو بہت دیکھی ہیں مگر افسوس کہ اپنے گھر کا جائزہ نہ لیا کہ یہاں کیسا سامان پڑا ہے، کہاں سے آیا ہے، اسکی کیا قدر و قیمت ہے، اسکا کیا مصرف ہے۔ غیروں کو کوسنے اور لعنت ملامت کرنے سے حاصل کیا؟ خود اپنا ذہن گندہ ہوتا ہے۔ اپنے ظرف کا پتہ چلتا ہے۔ اپنا نقصان ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک عظیم الشان خود فریبی ہے جس میں آج ہندی مسلمانوں کا قریب قریب کل علمی طبقہ مبتلا ہے۔ اسی کتاب میں ایک جگہ تو اسلام کے اعلیٰ آئین اخلاق اور بہترین اصول معاشرت پر فخر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ سیکڑوں صفحوں میں ہندوؤں کو برا بھلا کہا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی توقع ہے کہ ہندو ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور و خوض بھی کرینگے!

(۲) دوسری بات جو ایسی ہی نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ سارا الزام ہندوؤں پر رکھا گیا ہے۔ حکومت کی طرف کہیں ہلکا سا اشارہ بھی موجود نہیں اور ہے تو بہت مودبانہ انداز میں، جس سے اگر آئے تو وفاداری ہی کی بو آئے شکایت کی جھلک نہ ہو۔ دنیا جانتی ہے کہ انگریزی اقتدار نے اس ملک کے نام نہاد مسلمانوں کے رہے سہے علمی سرمایہ کو بھی کس طرح لوٹ کر برباد کیا اور کس طرح ہندوستان کی غیر مسلم قوموں سے اشتراک عمل کر کے مسلمانوں کو تاخت و تاراج کیا۔ باوجود اسکے اُس اقتدار اعلیٰ کو بے گناہ اور صرف اسکے آلۂ کار ہی کو گناہگار ٹھیرانا ایک عجیب بات ہے۔

(۳) تیسری اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ مغربی تصور قومیت کو جھٹلاتے ہوئے خود اُسے صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ فاضل مصنف کو یہ کھلا ہوا تضاد نظر نہ آیا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ ساری مسلم "قوم" اسوقت اسی دماغی الجھن میں گرفتار ہے۔ مغرب میں قومیت کی بنیاد نسل، رنگ، زبان، مذہب، معیشت، تمدن، تاریخ، اور جغرافی حدود پر رکھی جاتی ہے۔ انسانوں کی

ایک بڑے گروہ میں جب یہ چیزیں مشترک ہوں تو وہ ایک قوم بنتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ قومیت بنانے کے لیے یہ تمام اجزاء موجود ہوں بہرحال انہیں کے متنوع مرکبات سے قوموں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہندوستان کے ہندوؤں نے اسی تصور قومیت کو لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک ہے، اسکی ایک تاریخ ہے، یہاں کے بسنے والوں کا ایک تمدن ہے، وہ ایک زبان یعنی ہندوستانی بولتے ہیں، وہ یک رنگ ہیں وغیرہ وغیرہ پس ہندوستان کا ہر شخص ہندوستانی قومیت رکھتا ہے عام اس سے کہ اس کا مذہب اسلام ہو یا کچھ اور۔ اسکے جواب میں ہمارے مسلمان بھائی بیک وقت دو مختلف باتیں کہتے ہیں۔ ہندوستانی قومیت کی تردید کرنیکا جب موقع آتا ہے تو کہتے ہیں کہ اسلامی قومیت رنگ، نسل، زبان، وطن وغیرہ سے منزہ ہے اور صرف وحدت عقیدہ، وحدت مسلک اور وحدت مقصد پر قائم ہے۔ بخلاف اسکے جب قومی گھر کا مطالبہ کرنے کی نوبت آتی ہے تو یہ لوگ اسی تصور قومیت کو جوں کا توں لے لیتے ہیں جسکو ابھی جھٹلا چکے ہیں۔ اس وقت ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ شمالی مغربی ہند ایک الگ جغرافی خطہ ہے، یہاں کے رہنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں جنکا ایک مذہب ہے، ایک تاریخ ہے، ایک زبان ہے، ایک معاشرت ہے، ایک تمدن ہے، ایک نسل ہے، ایک رنگ ہے، اس لئے یہ اس خطے میں حکومت کرنے کے فطری طور پر حقدار ہیں۔ اُن کا یہ حق تسلیم۔ مگر کوئی یہ سمجھائے کہ پاکستان کے اس نظریے اور مغربی قوم پرستی میں فرق کیا ہے؟ کہنے کو آپ کہہ لیجیے کہ ہماری قومیت کی بنیاد عقیدے اور ایمان پر ہے لیکن جسطرح ایک ہندو بھگوان پر ایمان رکھتے ہوئے یورپ سے لائی ہوئی وطن پرستی کو اپنا بُت بنا لیتا ہے اسی طرح یہ ہندی مسلمان بھی توحید، رسالت، خلافت، دین اور شرع کے تخیل کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہوئے بلا تکلف وہ سب کچھ کر رہے ہیں جسکے خلاف وہ چیخ چیخ کے علم جہاد بلند کرتے ہیں۔ ہم سمجھنے سے قطعاً قاصر ہیں کہ پاکستان پرستی کا نظریہ ہندوستان پرستی سے کس حالت میں مختلف ہے۔ یہ بالکل وہی آواز ہے جو ایک نرالے ساز سے نکل رہی ہے ورنہ فرق ذرہ برابر نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نظریہ پاکستان کی بنیاد مسلم نیشنلزم پر ہے۔ جس طرح بنی اسرائیل یہ سوچتے ہیں کہ ایک مرتبہ خدا نے انکو منتخب کر لیا اب وہ ابدالاباد کیلیے اسکے خاص اور مقبول بندے ہو گئے اور ان

کی ایک مستقل قوم بنگئی، اسی طرح مسلمان بھی یہ سوچنے لگا ہے کہ اسلام اسکو وراثت میں ملا ہے، وہ تمام لوگ جو مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہو بہر حال مسلمان ہیں، خواہ وہ کچھ ہی کرتے پھریں، زندگی میں کچھ ہی نظریہ رکھیں، یہاں تک کہ وہ اسلام سے اتنے ہی دور رہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ جتنا کہ ایک ہندو یا عیسائی یا یہودی یا دہریہ ہو سکتا ہے، پھر بھی ماشاء اللہ وہ مسلمان ہی رہتے ہیں اور انکی ہیئت اجتماعی کا نام مسلم قومیت ہی رہتا ہے۔ قومیت کا یہ سراسر جاہلی تصور ہے۔ اسکو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام نطفہ یا وراثت میں کبھی منتقل نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک پارٹی کریڈ ہے۔ اگر ہم اس پر ایمان اور عمل چھوڑ دیں تو آج ہی غیر مسلم ہو جاتے ہیں۔ لہذا پہلی بات یہ ہے کہ اُن تمام انسانوں کو جو مسلمان والدین سے پیدا ہوئے مسلمان قوم فرض کر لینا ہرگز جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر صحیح معنوں میں کوئی اسلامی جماعت موجود ہو تب بھی اس کا کام خدا کی حکومت قائم کرنا ہے نہ کہ "اپنی"۔ اور یہاں یہ عجیب شور و ہنگامہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو حکومت کریں اور پاکستان میں "ہم"۔ پس اگر اس حکومت کو اسلامی حکومت کہا جائے تو یہ صریح دھوکا اور فریب ہے۔

(۴) یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ پاکستان میں ایک جمہوری نظام قائم ہوگا جس میں ہندوؤں، سکھوں اور دوسری اقلیتوں کو پورے پورے تحفظات کے ساتھ شریک فی الحکم کیا جائیگا۔ اسلام کے نزدیک تو یہ مجوزہ نظام ویسا ہی باغیانہ اور کافرانہ ہے جیسا کہ روس، جرمنی اور انگلستان میں ہے۔ اسلام کی تو ہر غیر الٰہی حاکمیت سے مستقل جنگ ہے خواہ وہ حاکمیت کسی ایک شخص یا ایک قوم کی ہو خواہ ہندو یا عیسائی یا مسلمان کی مشترک ہو۔ حتیٰ کہ اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی "اپنی" حکومت قائم کرنا چاہیں تو وہ اسلام سے باغی قرار دیے جائینگے۔ خود اختیاری (سلف ڈٹرمینیشن) کا تخیل ایک جاہلی تخیل ہے۔ دراصل یہ قوم پرستی اور وطن پرستی کا دوسرا نام ہے۔ مسلمان اس تخیل کی جڑ کاٹنے آیا ہے نہ کہ دوسروں کے توڑ پر خود اپنی خود اختیاری کا حق جتانے۔

(۵) فاضل مصنف نے اس امکان کو بھی محفوظ رکھا ہے کہ انگریز کے زیر سایہ رہکر "انڈستان" میں اسلامی خلافت کس طرح قائم ہو سکتی ہے! اس جسارت یا لاعلمی پر جسقدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ آخر اسلام ہی کا لیبل لگا کے دنیا میں ہر فعل کیوں کیا جائے؟ کس نے مجبور کیا ہے کہ آپ خواہ مخواہ اسلام پر احسان کیجیے؟

اگر یہ جنس مرغوب نہیں تو چھوڑ دیجیے، یہ کوشش کیوں ہو کہ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

(۶) سب سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم قوموں اور انگریزوں سے تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان میں "مسلم قوم" کی حکمرانی تسلیم کریں۔ اسلامی نظام کا تو ذکر ہی کیا، کسی جاہلی نظام میں بھی یہ قاعدہ معقول اور مسلّم نہیں ہے۔ جو قومیں خود اپنا اقتدار چاہتی ہیں، اور جہاں بانی کا حوصلہ رکھتی ہیں، وہ حکومت مانگا نہیں کرتیں، لڑ کر اپنی خواہش پوری کرتی ہیں۔

ان صفات کے باوجود کتاب دلچسپ ہے اور غالباً نظریۂ پاکستان کی سب سے اچھی وکالت ہے۔ لیکن دو چیزیں سمجھ میں نہ آئیں۔ ایک یہ کہ کتاب کا انتساب بیک وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم اور سر فضل حسین کے نام کیوں کیا گیا ہے۔ آخر ان دو شخصیتوں میں ذہنی یا نظری طور پر کیا چیز مشترک تھی؟ مصنف کو دونوں سے عقیدت ہو یہ اور چیز ہے لیکن اُس کا یہ کہنا کہ ان دو بزرگوں کی خدمات بھی ایک ہی نوعیت کی ہیں واقعی حیرت انگیز ہے۔ دوسری بات یہ کہ مصنف نے کتاب پر اپنا نام نہیں دیا ہے۔ آجکل پاکستان تحریک اور ہندی مسلم سیاست کے متعلق زیادہ تر لٹریچر فرضی ناموں سے شائع ہو رہا ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ لکھنے والے زیادہ تر سرکاری نوکر یا ملازم ہیں۔ قانونی طور پر مجبور ہیں کہ اپنے نام شائع کریں۔ لیکن وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ وہ اپنی قوم کے دل و دماغ ہیں اور ان کے حوصلہ و جرأت کا حال یہ ہے کہ نام کے اظہار سے بھی ڈرتے ہیں۔ پھر کیا انکی یہ توقع بے سود نہیں کہ قوم کے عوام ہمت کر کے آگے بڑھینگے اور پاکستان میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دینگے۔

بقیہ صفحہ ۱۶:- کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدہ کی حمایت میں کھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے؟ اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اسکے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟ ان سوالات کا جواب پبلک میں تو بہت سے لنگڑے لُولے عذرات کے ساتھ دیا جاتا ہے مگر پرائیویٹ صحبتوں میں صاف اقرار کر لیا جاتا ہے کہ دراصل اس راہ پر ہم اسلیے چل رہے ہیں کہ دین حق کے قیام کی راہ میں اس وقت بے حد مشکلات حائل ہیں۔ یہ وہی بات ہے جسکی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ ان لوگوں نے نہ تو مشکلات کی نوعیت کو سمجھا، نہ ان کو دور کرنے کی فکر کی، بس سرسری نظر میں صرف یہ دیکھ لیا کہ مشکلات حائل ہیں اور پھر ان سے دہشت زدہ ہو کر ایک غلط راہ پر چل پڑے۔

ایک اور گروہ نے تیسری راہ فرار اختیار کی ہے اور وہ پاکستان اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔

یہ اسکیم دراصل ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جنکے ذہن کی ساری تربیت مغربی اثرات کے تحت ہوئی ہے اور جنہوں نے تمدن و سیاست کے متعلق تمام تصورات یورپ کی تاریخ اور علوم عمران سے سیکھے ہیں۔ ایک مدت دراز تک تو ان لوگوں کی سمجھ میں یہی بات نہ آئی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو ایک قوم فرض کر کے یہاں جو جمہوری دستور نافذ کیا ہے اس میں بنیادی غلطی کیا ہے۔ یہ اپنے آپ کو واقعی ہندوستانی قوم کا ایک جزء تسلیم کرتے رہے اور انکی تمام تر کوششیں صرف اس حد تک محدود رہیں کہ اس قومیت کی بنیاد پر جو جمہوری نظام بنایا جا رہا ہے اس میں اپنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں۔ مگر جب کسی طرح چُول سیدھی نہ بیٹھی تو بمشکل انکی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہم کسی وطنی قومیت کے جزء نہیں ہیں بلکہ خود ایک مستقل قوم ہیں۔ لیکن "قوم" کے لفظ نے پھر انہیں دھوکا دیا۔ اس لفظ سے ان کا تعارف یورپین لٹریچر ہی کے واسطہ سے ہوا تھا، اسلیے یہ سمجھے کہ ہم بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دنیا میں دوسری قومیں ہوا کرتی ہیں، اور چونکہ یہاں ہماری تعداد کم ہے لہذا ہم ایک قومی اقلیت ہیں اور ہمارے مسائل

اُسی نوعیت کے ہیں جیسے دنیا میں قومی اقلیتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کچھ مدت تک اِس تصور کے تحت وہ مسائل "قومی" حل کرنے پر وقت ضائع کیا جاتا رہا۔ آخر کار جب یہاں بھی کوئی راہ نجات نظر نہ آئی اور معلوم ہوا کہ جمہوری اصولوں کے اندر قومی اقلیتوں کے لیے زندگی کی کوئی سبیل نہیں ہے، تو اِن کا ذہن اِس طرف منتقل ہوا کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں ہماری اکثریت بھی تو ہے، پھر کیوں نہ ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں، جن ٹکڑے میں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری قومی حکومت قائم ہو اور دوسرے قومی اقلیت قرار پائیں، اور جہاں دوسروں کی اکثریت ہے وہاں اُنکی قومی حکومت ہو اور ہم قومی اقلیت کی حیثیت سے رہیں ـــــ یہ اس پاکستانی تخیل کے ارتقاء کی مختصر تاریخ ہے۔ اور یہ تاریخ خود شاہد ہے کہ نقطۂ آغاز سے لیکر نقطۂ انجام تک ہر مرحلہ میں یہ تخیل مغربی تصوراتِ قومیت کے زیر اثر پرورش پاتا رہا ہے۔ مگر آخری مرحلہ پر پہنچ کر یکایک اس میں اسلامی نصب العین کا جوڑ لگا دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ جب جمہوری اصول پر (یعنی اس اصول پر کہ باشندگانِ ملک خود مالک الملک ہیں) پاکستان میں "مسلمانوں" کی اکثریت کا اقتدار قائم ہو جائیگا تب ہم رفتہ رفتہ نظام حکومت کو تبدیل کر کے اسلامی اصول پر ڈھال دینگے۔

اس تخیل میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ طرزِ فکر اور طریق عمل تو ہے سراسر غیر اسلامی، مگر نام بار بار لیا جاتا ہے اسلام اور مسلمان کا۔ بلاشبہ اسلام اپنے پیروؤں کو ایک مستقل "امت" بناتا ہے، ایسی امت جو کسی دوسری قومیت میں بحیثیت ایک جزء کے شامل نہیں رہ سکتی، مگر یہ امت اُس چیز سے بالکل مختلف نوعیت کی ہے جس پر مغربی علوم اجتماع میں لفظ "نیشن" کا اطلاق کیا جاتا ہے، اور اسی طرح اسکے مسائل اور اسکے مقاصد بھی اُس سے بالکل مختلف ہیں۔ مغربی قومیت کسی عقیدے اور کسی اخلاقی نصب العین کی بنیاد پر نہیں بنتی بلکہ تاریخی تعصبات اور موروثی تہذیب و تمدن سے بنتی ہے۔ اس کے

پاس کسی قسم کے اصول حق نہیں ہوتے جنہیں پیش کرکے وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دے سکے بلکہ وہ محض اپنے چند تعصبات رکھتی ہے جو نا قابلِ تبلیغ شے ہیں۔ اسکے سامنے کوئی اخلاقی مقصد بھی نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ اپنی قومی انفرادیت کا تحفظ کرے اور جو لوگ اس قوم میں پیدا ہوئے ہیں اُنکے دنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرے۔ اسی وجہ سے اس قومیت کے لیے کثرت و قلت کا سوال پیدا ہوتا ہے، اسی وجہ سے دوسری قوموں کے ساتھ دنیوی مفاد کے لیے اُسکی کشمکش ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ چاہتی ہے کہ جہاں اسکی کثرت ہو وہاں اسکی قومی حکومت قائم ہو جائے اور جہاں اُسکی قلت ہو وہاں اسکے لیے دستوری تحفظات کا انتظام کیا جائے۔ لیکن اسلام جو امت بناتا ہے اُسکی سرے سے یہ حیثیت ہے ہی نہیں۔ یہ امت صرف اس وجہ سے بنتی ہے کہ اسلام تمام انسانی قوموں کے سامنے ایک عقیدہ اور ایک ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے اور جو لوگ اس کو قبول کر لیتے ہیں وہ ایک امت بن جاتے ہیں۔ اس امت کا کوئی مقصد اسکے سوا نہیں ہے کہ اسلام کے عقیدے اور ضابطہ کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اسکے لیے کثرت اور قلت کا کوئی سوال نہیں۔ یہ ایک کی اقلیت سے شروع ہوتی ہے اور سو فی صدی اکثریت تک پہنچ سکتی ہے جس طرح تمام قوموں سے نکل نکل کر لوگ اب تک اس امت میں آتے رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی آسکتے ہیں۔ اسکا کام دنیا کی دوسری قوموں سے اپنے دنیوی مفاد کے لیے لڑنا نہیں ہے بلکہ انہیں اپنے اصولِ حق اور اپنے اخلاقی نصب العین کی طرف دعوت دینا ہے۔ اسکے دعوے کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ یہاں ہم ۶۵ یا ۷۰ فی صدی ہیں اس لیے یہاں ہماری حکومت ہونی چاہیے، بلکہ اسکے دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ یہ اصولِ حق ہیں جن پر تمدن و سیاست و اخلاق کا نظام تعمیر ہونا انسانی فلاح و سعادت کا واحد ذریعہ ہے لہٰذا تمام دنیا کو ہم انکی طرف دعوت دیتے ہیں اور جس سرزمین کے لوگ بھی ان پر راضی ہو جائیں وہاں ہم ان اصولوں کی حکومت قائم کرینگے خواہ وہ جمنا اور اٹک کے درمیان واقع ہو یا نربدا اور گنگا کے درمیان یا قطب شمالی و جنوبی کے درمیان۔ اب ہر وہ شخص جو ذرہ برابر بھی حقائق میں بصیرت رکھتا ہو، علانیہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ اسلامی امت کی اس حیثیت میں اور پاکستانی تخیل

کے بانیوں اور حامیوں کی اُس حیثیت میں جو اوپر بیان ہوئی بعد المشرقین ہے۔ اگر یہ لوگ واقعی اسلامی امت ہیں تو ان کا سارا مقدمہ ہی بے بنیاد اور سراسر غلط ہے۔ اور اگر انکے مقدمہ کی حقیقی صورت نوعیت یہی ہے تو انکو اسلام اور اسلامی امت کے نام سے یہ مقدمہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایسا مقدمہ لے کر اُٹھنے والوں کو اپنی قومیت کا کوئی دوسرا نام تجویز کرنا چاہیے۔

دوسری عظیم الشان غلطی اس تخیل میں یہ ہے کہ یہ لوگ "پاکستان" تک ناپاکستان کے راستہ سے پہنچنا چاہتے ہیں۔ اِن سے جب پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان سے تمہاری مراد کیا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک پاکستان وہ ہے جہاں حاکمیت صرف اللہ کی ہو اور جو انسان کی حاکمیت سے پاک ہو۔ پھر جب ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ یہ پاکی وطہارت محض شمالی مغربی ہندوستان اور بنگال کے لیے آپنے کیوں مختص فرمادی؟ باقی ماندہ ہندوستان نے کیا قصور کیا ہے کہ اسکو آپ "پاکستان" بنانے سے منہ موڑتے ہیں؟ تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اِن علاقوں میں اُن لوگوں کی (یعنی مسلمانوں کی) اکثریت ہے جو اللہ کی حاکمیت پر پہلے ہی ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا پہلے ہم یہاں پاکستان بنائینگے اور پھر ہندوستان کے دوسرے حصوں کو اسی پاکی وطہارت کی طرف دعوت دینگے ——— اِس سوال وجواب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا شمالی مغربی ہندوستان اور مشرقی ہندوستان کی اکثر آبادی اللہ کی حاکمیت قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ مگر جب ہم انکی اسکیم کی تفصیلات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ اِن علاقوں میں مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر اکثریت کی حکومت (یعنی وہی ناپاکستان) قائم کرینگے، پھر کہیں پاکستان کے لیے زمین تیار کرنے کی نوبت آئیگی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ علاقہ واقعی حکومت الٰہی کے لیے تیار ہے، جیساکہ آپنے پہلے فرض کیا تھا تو قومی جمہوریت کی ناپاکی میں سے ہوکر جانے کے بجائے آپ براہِ راست الٰہی حکومت کی طرف ہی اقدام کیوں نہیں فرماتے؟ اور اگر یہ بھی اُسی طرح تیار کیے جانے کا محتاج ہے جس طرح باقی ہندوستان ہے تو پھر سارے

ہندوستان کو بلکہ دنیا کو پاکستان بنانے کے لیے ایک اصولی دعوت لے کر اٹھنے کے بجائے آپ نے نام نہاد مسلم اکثریت کے صوبوں کو ہی اپنا ہدفِ مقصود کیوں بنا لیا ہے؟ اِن صوبوں میں جمہوری حکومت کا قیام آخر کس معنی میں حکومت الٰہیہ کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ ایران، ٹرکی، عراق وغیرہ ممالک میں تو ایسے ہی نسلی مسلمانوں کو قومی جمہوریت اس وقت حاصل ہے۔ پھر کیا وہاں حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرنا اس سے کچھ کم مشکل اور کم خطرناک ہے جتنا کسی کافر حکومت میں ہو سکتا ہے؟

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں عوام الناس خدا کے بجائے اپنی اغراض نفسانی کے بندے بنے ہوئے ہوں، اور جہاں لوگ اپنی خواہشاتِ نفس سے دست بردار ہو کر خدا کے آگے بالکل سرِ تسلیم خم کر دینے پر آمادہ نہ ہوں، خواہ ایسی آبادی کا نام اصطلاحاً مسلمان ہو یا غیر مسلم، بہر حال ایسی جگہ جمہوری اصول پر جو لوگ برسرِ اقتدار آئینگے وہ خدا کے مطیع بندے تو نہیں ہونگے — ناپاک دودھ میں سے جو مکھن نکلے گا لامحالہ وہ خلاصۂ نجاست ہی ہوگا — اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار کا آنا طبعاً و لازماً حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے کسی طرح مددگار نہیں ہو سکتا۔ الٰہی حکومت تو صرف اسی حالت میں قائم ہو سکتی ہے جبکہ ایک خالص اسلامی تحریک کے ذریعہ سے عوام الناس کے اخلاقی نقطۂ نظر کو بالکلیہ تبدیل کر دیا جائے۔ اور یہ تحریک جہاں بھی اٹھیگی ہر باغی حکومت اسکے لیے یکساں مزاحم ثابت ہوگی خواہ اسکے حکمراں کھلے کافر ہوں یا نام کے مسلمان۔ پھر جب ہمیں ایک خالص اصولی تحریک کے ذریعہ سے عوام الناس میں خدا پرستانہ ذہنیت و اخلاق پیدا کرنا ہی ہے اور تمام حاضر الوقت نظامات سیاسی کے علی الرغم کرنا ہے، تو ہم پیدائشی مسلمان اور پیدائشی غیر مسلم سب کے پاس ایک ہی ساتھ کیوں نہ جائیں؟ کیوں ہم اسکو مسلمانوں کی آبائی جائداد سمجھ کر انہی میں تقسیم کرنے کی فکر کریں؟ اور کیوں ہم خواہ مخواہ پہلے ایک جغرافی حد بندی قائم کر کے اپنی تحریک کو محدود کر لیں؟ کیوں نہ ہم ان تمام لوگوں تک اپنی آواز پہنچائیں جنکو ہم اپنی بات سمجھا سکتے ہیں؟ غیر اللہ کی بندگی سے آزاد ہو کر صرف اللہ کا بندہ بن جانا تو ایک نعمت ہے

جو تمام انسانوں کے سامنے پیش کی جانی چاہیے۔ اگر نسلی مسلمان سب سے آگے بڑھ کر اس نعمت کو حاصل کر لیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن اگر دعوتِ اسلام میں یہ پیچھے رہ جائیں اور دوسرے پیش قدمی کر کے اسے لینے کے لیے تیار ہو جائیں تو کیوں نہ "پاکستان" پہلے انہی کے درمیان قائم کیا جائے۔

یہ باتیں جب پاکستانی حضرات کے سامنے عرض کی جاتی ہیں تو وہ بھی اپنی مشکلات کی داستان بیان کرنی شروع کر دیتے ہیں جن سے خوف زدہ ہو کر بعض لوگوں نے ہندوستانی وطن پرستوں کے ساتھ میل کیا ہے اور بعض دوسرے لوگوں نے اسلام کو اجزاء میں تقسیم کر کے چند اجزاء لینے اور چند کو چھوڑ دینے کی تدبیریں سوچنی شروع کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ صاحب! اسلام کے خلاف تو ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، بھلا اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے کہاں چل سکتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعات کو غلط رنگ میں دیکھنا اور غلط نتائج نکالنا ہے۔ بے شک تعصبات موجود ہیں، مگر وہ اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصۃً للہ کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہٰذا ان تعصبات کا صحیح علاج یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور اس کے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر یہ نہ کہیے کہ اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی

تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہینگے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثہ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپکا قومی مذہب بنکر رہیگا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکیگا۔

پس یہ ایک حقیقت ہے کہ اسوقت جو لوگ نیک نیت ہونے کے باوجود براہ راست حق کی طرف پیش قدمی کرنے سے جھجک رہے ہیں اور پھیر کے راستوں پر چلے جارہے ہیں، اُن سب کی غلط روی کا مشترک سبب ایک ہی ہے کہ وہ اسلامی تحریک کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ حائل دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش کرتے ہیں مگر خود ان پہاڑوں کا جائزہ لے کر نہیں دیکھتے کہ یہ پہاڑ ہیں کس قسم کے۔ حالانکہ تحقیق کرنے سے ان پہاڑونکی حقیقت بآسانی معلوم کی جاسکتی ہے۔ پہلے اسلام کے اصولوں کو دیکھیے کیا بجائے خود انکے اندر ایسی کوئی خرابی ہے کہ انسان بالعموم اس دین کو قبول نہ کر سکتے ہوں اور یہ صرف ایک خاص قوم کا مسلک بنکر ہی رہ سکتا ہو؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے، تو پھر انسانوں پر نگاہ ڈالیے، کیا آج اُن میں کوئی ایسی غیر معمولی خاصیت پیدا ہوگئی ہے جو پہلے زمانے کے انسانوں میں نہ تھی اور جسکی وجہ سے اب انکا اسلامی تحریک سے متاثر ہونا غیر ممکن ہوگیا ہے؟ کیا نفسِ انسانیت کی ترکیب اور اسکے مزاج میں اب کوئی تغیر آگیا ہے؟ کیا اللہ نے اب دنیا میں کسی نئے ماڈل کے انسان بنانے شروع کردیے ہیں کہ ان میں صرف ابوجہل اور ابولہب ہی پائے جاسکتے ہیں، ابوبکر صدیق، عمر فاروق، سلمان فارسی اور بلال حبشی نہیں پائے جاسکتے؟ اگر یہ بات بھی نہیں تو پھر اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا کہ یہ ساری مشکلات جو اسلامی تحریک کی راہ میں سدِّ سکندری بنی نظر آرہی ہیں، اسلام کے پیرووں کی پیدا کردہ ہیں۔ اُنکی کسی کمزوری اور کسی غلط روش نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور جب ان مشکلات کی حقیقت یہ ہے تو صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ مشکلات سے بچنے کے لیے سیدھا راستہ چھوڑ کر پھیر کے راستوں سے نکلنے کی کوشش کی جائے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس غلطی کی اصلاح اور اُس کمزوری کا علاج کیا جائے جسکی وجہ سے یہ صورت حال رونما ہوئی ہے۔

اس بحث کی ابتدا میں ان مشکلات کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اُس پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی روش میں کس قسم کی اصلاح مطلوب ہے۔ ہم جب اپنے آپکو مسلمان کہتے ہیں تو

در اصل یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نفس پرست یا دنیا پرست نہیں بلکہ خدا پرست ہیں۔ ہمارے اس دعوے کا ثبوت ہماری زندگی سے ملنا چاہیے۔ اللہ رب العالمین پر ایمان لانے کے بعد ہماری حیثیت اُن انسانوں کی سی نہیں رہتی جو اللہ کے بجائے اپنے نفس کی خواہشات پر، یا اپنی دنیوی اغراض پر، یا اپنی قوم اور اپنے ملک پر ایمان لاتے ہیں۔ لہٰذا ہم وہ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد نہیں ہیں جو وہ کرتے ہیں، اور نہ ہم کو جاہلیت کے وہ طریقے زیب دیتے ہیں جو اُن کے لیے خوشنما اور مزین ہیں۔ ہم دنیا میں عدل و قسط کا نظام قائم کرنے پر مامور ہیں، ہمارے سپرد دنیا کو خیر و صلاح کی طرف دعوت دینے اور شر و فساد کا خاتمہ کرنے کی خدمت کی گئی ہے، ہمیں اپنے مفاد یا کسی خاص قوم کے مفاد کی خدمت کے لیے نہیں اٹھایا گیا بلکہ انسانیتِ عامہ کی فلاح و سعادت کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹے چھوٹے دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے جھگڑے کریں۔ نہ قوم پرستانہ تنگ نظری اور اسکے ذلیل ہتھکنڈے اور اسکے مایۂ شر و فساد قضیے ہمارے لیے موزوں ہیں۔ اور نہ ہم کو یہ مناسب ہے کہ اُن ادنیٰ درجہ کے مقاصد کے لیے جدوجہد کریں جنہیں اسلام نے ہماری کوششوں کا مقصود نہیں ٹھیرایا ہے۔ ہمیں اپنے دل کو تمام نفسانی محبتوں اور عداوتوں سے، تمام تعصبات سے اور تمام دنیوی اغراض سے پاک کر لینا چاہیے۔ دوسروں کے دل خواہ کتنے ہی تنگ ہوں، ہمارے دل فراخ ہونے چاہییں۔ دوسروں کی نظر خواہ کتنی ہی پست ہو، ہماری نظر بلند ہونی چاہیے۔ دوسرے اپنی شخصی یا قومی اغراض کے لیے خواہ کتنی ہی تگ و دو کریں، ہمیں انکی پیروی کرنی چاہیے۔ اُنکے برعکس ہم کو تو اپنے دل سے یہ خیال بالکل نکال ہی دینا چاہیے کہ کسی غیر الٰہی نظام تمدن و سیاست میں بھی ہمارا کوئی شخصی یا قومی مفاد ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے تو در اصل ہمارا کوئی مفاد اسکے سوا ہے ہی نہیں کہ یہ غلط نظامِ زندگی من حیث الکل فنا ہو جائے اور اسکی جگہ اُن اصولِ حق پر اجتماعی زندگی کی تعمیر ہو جنکی تعلیم خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے نوعِ انسان کو دی ہے۔ اسی مفاد پر ہم کو اپنی تمام توجہات کو مرکوز کر دینی چاہییں اور ہر دوسرے مفاد کو ٹھوکر مار دینی چاہیے۔ یہ روش جب ہم اختیار کرینگے اور جب ہمارے اقوال و افعال انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اسی روش کے مطابق ہونگے اور متناقض باتوں سے ہمارا طرزِ عمل پاک ہوگا تب ہمارے گرد و پیش کے لوگ ہمارے خلوصِ نیت سے مغلوب و متاثر ہونے لگینگے اور تب ہی ہماری دعوت الی الخیر انکے دلوں تک نفوذ کریگی۔ محض کتابوں میں لکھا ہوا حق کم

ہی لوگوں کو مسخر کرتا ہے۔ مگر جب حق پرستوں کی ایک جماعت اسکی پشت پر موجود ہو اور لوگ اس جماعت کی زندگی میں عیاناً حق کا مشاہدہ کر لیں تو آبادیوں کی آبادیاں اسکے آگے سپر ڈالتی چلی جاتی ہیں۔

یہ روش اختیار کرنے کا جب مشورہ دیا جاتا ہے، تو دو شکوک اور پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ تمام نسلی مسلمانوں کے اخلاقی نقطۂ نظر، انکی عملی زندگی، اور انکے اجتماعی رویہ میں اتنا بڑا تغیر آنا فاناً تو نہیں ہو سکتا۔ اسکے لیے مدت دراز درکار ہے۔ اور جب تک یہ سب کے سب بدل جائیں وہ پالیسی نہیں چل سکتی جو تم تجویز کر رہے ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسلمان اس روش کو اختیار کر بھی لیں تو آخر انکے سیاسی معاشی مفادات کا کیا حشر ہوگا۔ ایک طرف دوسری قومیں پوری ہوشیاری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فائدے سمیٹنے میں لگی ہوئی ہوں اور دوسری طرف ہم اپنے مفاد کی فکر سے بے پروا ہو کر خالص حق پرستی میں مشغول ہوں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم دیکھتے دیکھتے زمین سے بے دخل ہو جائینگے اور صرف ہوا میں ہمارا ٹھکانا رہ جائیگا۔

یہ دونوں شبہے جن اصحاب کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں انکے دلوں کی اصلی بیماری یہ ہے کہ وہ اس روش کو ایک چال یا پالیسی سمجھ کر اس حیثیت سے جانچنا چاہتے ہیں کہ یہ کارگر کہاں تک ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر کارگر ہو اور بے خطر بھی ہو تو اسے اختیار کیا جائے ورنہ کوئی دوسرا ڈھنگ تلاش کیا جائے۔ حالانکہ میں اس روش کا مشورہ پالیسی کی حیثیت سے نہیں بلکہ حق ہونے کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صالحین اسی روش پر چلے ہیں۔ یہی طریق حق ہے۔ اسکے سوا کوئی دوسرا برحق طرزِ عمل ہے نہیں کہ دونوں کے درمیان اختیار و انتخاب کا سوال پیدا ہو۔ لہذا اہلِ ایمان کو منفعت پرستانہ ذہنیت کے ساتھ یوں نہیں سوچنا چاہیے کہ اس راہ سے کام بنتا ہے تو اس پر چلیں ورنہ کوئی دوسری راہ نکالیں۔ بلکہ اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے اسکے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار ہے نہیں۔ پھر جب وہ اپنی ذہنیت کی اصلاح کر لیں تو انکے دونوں شبہوں کا مختصر جواب یہ ہے:

(۱) تمام مسلمانوں کے اخلاق، اعمال اور اجتماعی رویہ میں تغیر آنیکا انتظار کرنیکی کوئی حاجت نہیں۔ لَا یَضُرُّکُمْ

مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ۔ جس جس کا قلب شہادت دیتا جائے کہ طریق حق یہ ہے وہ اپنی روش کی اصلاح کرے اور اپنی سعی و جہد کا محور اپنے یا اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے بجائے جہاد فی سبیل اللہ کو بنائے۔ پھر اسکو لازم ہے کہ اپنے گرد و پیش کے انسانوں کو (مسلمانوں کو بھی اور غیر مسلموں کو بھی) خیر کی طرف دعوت دے۔ اور جو اس دعوت کو قبول کرے اُسے اس جہاد میں اپنا رفیق سمجھے۔

(۲) کوئی فرد ہو یا جماعت یا قوم، بہرحال اسے اگر کسی بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کرنی ہے تو لامحالہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں کی قربانی گوارا کرنی ہی پڑیگی۔ دنیا میں کوئی بڑی چیز چھوٹی چیزوں کی قربانی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اگر زمین پر خدا کی بادشاہی کسی کی نگاہ میں بڑا مقصد ہو تو اسکی نگاہ میں تمام سیاسی و معاشی مفادات چھوٹی چیز ہو جانے چاہییں اور اسے ہر دنیوی نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اور اگر اسکے نزدیک یہ فائدے بڑی چیز ہیں اور اس مقصد کی بہ نسبت عزیز تر ہیں تو پھر بہتر یہی ہے کہ وہ اس مقصد کا نام ہی نہ لے۔ نہ یہ مقصد ایسے لوگوں کے لیے ہے اور نہ ایسے لوگ اس مقصد کے لیے۔

موجودہ سیاسی مسائل کے باب میں جو کچھ مجھے مسلمانوں سے کہنا تھا، اب میں قریب قریب سب کچھ کہہ چکا ہوں۔ ابتک یہ خیالات چونکہ منتشر طور پر شائع ہوتے رہے ہیں اسلیے بکثرت لوگ میرا نقطۂ نظر پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ عموماً یہی ہوا کیا کہ کسی صاحب نے میرے ایک آدھ مضمون کو کہیں سے دیکھ لیا اور پھر طویل خط و کتابت یا لمبی چوڑی بحثوں میں اپنا بھی وقت ضائع کیا اور میرا بھی۔ اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے ان تمام مضامین کو جو پچھلے دو سال میں لکھے گئے ہیں ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیا جائے، اور ترتیب دیتے وقت جہاں جہاں کوئی مضمون تشنہ رہ گیا ہو، یا کہیں کوئی شگاف کھلا رہ گیا ہو اسکی تکمیل کر دی جائے۔ اس طرح جب تمام پہلو ناظرین کے سامنے آجائینگے تو بیشتر غلط فہمیاں دور ہو جائینگی۔ امید ہے کہ آئندہ مہینہ کے اختتام تک یہ مجموعہ ناظرین کو مل جائیگا۔ و باللہ التوفیق۔

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

معرفت سرمد برقی پریس ... روڈ لاہور میں طبع ہوا